طلوع اسلام

نومبر ۱۹۵۱

-/8/-

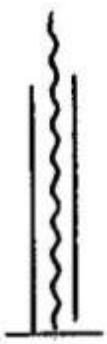

صحیح انتخاب اس وقت ہو سکتا ہے

جب آپ کے سامنے انتخاب کیلئے قسم قسم کا مال موجود ہو

خریداری کا فیصلہ

اس وقت ہو سکتا ہے جب آپ تسلی کر لیں کہ قیمت واجبی ہے اور

آپ کا اطمینان

اس وقت ہو سکتا ہے جب آپ خرید کردہ مال کے استعمال کے بعد دیکھ لیں کہ جیسا کہا گیا تھا مال ویسا ہی نکلا

آپ یونہی پریشان نہ ہوئیے

ہمارے ہاں آئیے اور دیکھئے کہ مذکورہ بالا شرائط کے مطابق آپ کا اطمینان ہوتا ہے یا نہیں۔

ہمارے ہاں ہر قسم کا ہوزری سامان، ٹائیلٹ کے لوازمات، اون، گرم کپڑا، ٹیلرنگ (صرف جنٹس کے لئے) تحفہ جات اور دیگر متفرق اشیائے ضروریات کا بہت بڑا اسٹاک موجود رہتا ہے۔

تھوک کے لئے — سمرسیٹ سٹریٹ کراچی

اور پرچون کیلئے — الفنسٹن سٹریٹ کراچی

تشریف لائیے

نیز ہم ہوزری کا نہایت اعلیٰ مال خود تیار کرتے ہیں۔

کوہِ نور نٹنگ ملز۔ کلیٹن روڈ۔ کراچی

ہماری صناعی کا مرکز ہے۔ نفاست اور پائیداری میں بہت کم ملز اس کا مقابلہ کر سکتی ہیں۔

نیاز آگیں: ایچ غلام محمد اینڈ برادرز۔ کراچی

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلّہ

طلوعِ اسلام

کراچی

قیمت فی پرچہ	مرتّبہ	بدل اشتراک
آٹھ آنے (پاکستانی)	محمد یونس	سالانہ: چھ روپے پاکستانی (نو روپے ہندوستانی)
بارہ آنے (ہندوستانی)		غیر ممالک سے ۱۲ شلنگ

جلد ۴	نومبر ۱۹۵۱ء	نمبر ۱۱

فہرستِ مضامین

لمعات	۵ - ۱۸	عالم اسلام (عبدالرحمٰن صدیقی صاحب)	۶۱ - ۷۰
نظریۂ ارتقاء اور قرآن (پرویز صاحب)	۱۹ - ۳۱	حقائق و عبر	۷۱ - ۷۶
سلیم کے نام (پرویز صاحب)	۳۲ - ۴۴	نقد و نظر	۷۷
نادر شاہ اور اتحاد سنی و شیعہ (علامہ اسلم جیراجپوری صاحب)	۴۵ - ۶۰	حوادث (نظم) (اسد ملتانی صاحب)	۷۸

ادبی پریس کراچی

نوادرات

(مجموعہ مضامین علامہ اسلم جیراجپوری)

بڑا سائز ضخامت ۴۰۰ صفحات

قیمت مجلد۔ چار روپے محصول ڈاک علاوہ

معراجِ انسانیت (معارف القرآن جلد چہارم)

سیرت صاحبِ قرآن ——— قرآن کے آئینے میں

(قیمت بیس روپے) دو ماہ کیلئے رعایتی قیمت بارہ روپے علاوہ محصول ڈاک

تاریخِ رسالت (معارف القرآن۔ جلد سوم)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پیشتر کے انبیائے کرامؑ کی دعوات انقلاب کا تذکرہ

(قیمت پندرہ روپے) دو ماہ کیلئے رعایتی قیمت دس روپے علاوہ محصول ڈاک

ادارہ طلوعِ اسلام، رالسن روڈ، کراچی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لمعات

۱۱ھ ہجری کا واقعہ ہے۔ ربیع الاول کی پہلی تاریخ، سہ پہر کے وقت، یہ خبر مدینہ کے گلی کوچوں میں بجلی کی طرح پھیل گئی کہ نبی اکرمؐ اس دنیا سے تشریف لے گئے۔

یہ کس کی وفات کی خبر ہے؟ اس ذاتِ گرامی کی جس نے عرب کی اونٹ چرانے والی اور کھجور کی گٹھلیوں پر گذارا کرنے والی قوم کو قیصر و کسریٰ کے تاج و تخت کا وارث بنا دیا۔ جس نے انھیں عہدِ جاہلیت سے نکال کر اقوام و مللِ عالم کے علم و تمدن کی امامت عطا فرما دی۔ جس نے انھیں سبعیت و بربریت کی وحشت انگیز پستیوں سے اٹھا کر مکارمِ اخلاق کی سعادت ریز بلندیوں پر سرفراز فرما دیا۔ جس نے ان کی عداوتوں کو محبتوں سے، ان کی رقابتوں کو رفاقتوں سے، ان کی شقاوتوں کو سعادتوں سے، ان کی کثافتوں کو لطافتوں سے اور ان کی قساوتوں کو رافتوں سے بدل دیا۔ وہ جس نے انھیں انفرادیت کے انسانیت کش مسلک کے بجائے، اجتماعی ربط و نظم کا حیات آور مشرب سکھایا۔ جس نے ان کے معاشرہ کو مفسدانہ ناہمواریوں سے پاک اور صاف کر کے، اُسے مصلحانہ ہمواریوں کی محکم بنیادوں پر استوار کر دیا۔ جس نے انھیں ملوکیت کے استبدادی شکنجوں سے نجات دلا کر حریت و آزادی کی فضائے بسیط میں بال کشائی کے طور طریق سکھائے۔ جس نے ان کی گردن سے برہمنیت کے تقدس آمیز طوق و سلاسل اتار کر ان کا خدا سے براہِ راست تعلق پیدا کر دیا۔ جس نے ان کے لئے ایسی فضا پیدا کر دی جس میں ہر طرف سے لاخوف علیھم ولاھم یحزنون کی طمانیت بخش بشارتیں، فردوس گوش بنتی تھیں۔ جس نے ان کے لئے ایک ایسا ماحول تیار کر دیا جس میں انسانیت کی تمام مضمر صلاحیتیں بالیدگی حاصل کرتیں اور ثمر بار ہوتی تھیں۔ کشجرۃ طیبۃ اصلھا ثابت وفرعھا فی السماء۔ غرضیکہ یہ وفات کی خبر تھی اس محسنِ اعظمؐ کی جس نے انھیں وہ سب کچھ عطا کر دیا جو انسانیت کی انتہائی آرزو کہلا سکتا ہے اور جس کے بعد کچھ اور مانگنے کو باقی ہی نہیں رہتا۔

اس خبر نے مدینہ کی بستی میں ایک حشر برپا کر دیا۔ ان کی نگاہوں میں دنیا اندھیر ہو گئی۔ دردِ فراق سے سینے شق ہو گئے۔ انھیں بزمِ کائنات بے کیف نظر آنے لگی۔ بہارِ زندگی ان کی نگاہوں میں افسردہ و پژمردہ ہو گئی۔ وفورِ جذبات سے دل کا خون آنکھوں میں کھنچ آیا۔ شدتِ احساس سے جگر کے ٹکڑے ہو گئے۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا یہ سارا نظام درہم برہم ہو رہا ہے۔ یوں دکھائی دیتا تھا جیسے اس معاشرے کا قصرِ مشید متزلزل ہو رہا ہے۔ مملکت نوزائیدہ تھی۔ نظام ہنوز اپنے ابتدائی ایام سے گذر رہا تھا۔ حضرت عمرؓ کی دوربین نگاہوں نے اس خبر کے یوں عام ہو جانے میں کچھ خطرات محسوس کئے۔ انھوں نے روک دیا کہ کوئی شخص اس کا چرچا نہ کرنے پائے۔ لیکن اس کا چرچا ہونے پائے یا نہ، فرطِ غم و الم اور شدتِ درد و کرب سے، ہر دل سے صبر و سکون و داع اور

ہر دماغ سے ہوش و حواس رخصت ہو رہے تھے۔

لیکن کہرام و خلفشار کے اس ہوش ربا محشر میں ایک ایسا پیکرِ ضبط و سکون بھی تھا جسے تربیت نبویؐ نے جبر میں اور بے قراری میں قرار کا سلیقہ سکھایا تھا۔ وہ جسے غار کی یاس انگیز تنہائیوں میں لا تحف ان اللہ معنا کی ایمان افروز و استقامت بخش تعلیم سے نا امیدیوں کے ہجوم میں امیدوں کا روشن مستقبل دیکھنے کا انداز بتایا تھا۔ وہ پیکرِ ضبط و استقامت۔ وہ یارِ غارِ نبویؐ۔ وہ جس کے کندھوں پر جانشینیٔ رسولؐ کا بارِ عظیم آنے والا تھا۔ غم و اندوہ کے اس تلاطم میں روشنی کے بلند مینار کی طرح اٹھا اور دو جملوں میں مجمع کے سامنے اس حقیقتِ کبریٰ کو بے نقاب کر گیا کہ اسلام کا نظام اپنے محکم اصولوں کی داخلی قوتوں کے زور پر برقرار رہنے اور آگے بڑھنے کے لئے وجود میں آیا ہے۔ وہ شخصیتوں کا وابستۂ دامن نہیں ہے کہ کسی ایک فرد کی وفات سے پورے کا پورا نظام درہم برہم ہو جائے۔ حضرت صدیقِ اکبرؓ منبر پر تشریف لائے اور دل کے کامل سکون اور اطمینان سے فرمایا کہ

ایھا الناس! من کان یعبد محمدا فانہ قد مات ومن کان یعبد اللہ فانہ حی لا یموت۔

لوگو! جو شخص محمدؐ کی ذات کا محکوم تھا، وہ سمجھ لے کہ اس کا معبود آج مر گیا ہے۔ لیکن جو شخص اللہ (کے نظام) کی محکومیت اختیار کئے ہوئے ہے اسے جان لینا چاہئے کہ اللہ ہمیشہ کیلئے زندہ ہے (اور اس کا نظام پائندہ) اسے کبھی موت نہیں آسکتی۔

اور اس کے بعد اپنے اس دعوے کی سند میں قرآن کی یہ آیت تلاوت فرمائی کہ

وما محمد الا رسول۔ قد خلت من قبلہ الرسل۔ افائن مات او قتل انقلبتم علیٰ اعقابکم۔ ومن ینقلب علیٰ عقبیہ فلن یضر اللہ شیئا۔ وسیجزی الشاکرین۔ (۳/۱۴۴)

اور محمدؐ اس کے سوا کیا ہیں کہ خدا کے قانون کے پہنچانے والے ہیں۔ ان سے پہلے بھی اسی قسم کے پیامبر گذر چکے ہیں (جو اللہ کا قانون انسانوں تک پہنچا کر وفات پا گئے) پھر اگر ایسا ہو کہ یہ بھی وفات پا جائیں (اور بہر حال، ہر انسان کو ایک دن مرنا ہے) یا (فرض کرو کہ) وہ قتل کر دیئے جائیں، تو کیا تم (ان کی وفات کے ساتھ ہی) اس نظام سے الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ جو کوئی تم میں سے ایسا کرے گا وہ اپنا ہی نقصان کرے گا۔ خدا کا کچھ نہیں بگاڑے گا۔ اور جو لوگ (اس حادثہ کے بعد) اپنی محنتوں کو اور بھی زیادہ ثمر بار بنانے کی کوشش کریں گے تو اللہ (کا نظام) اس کا نتیجہ مرتب کر کے سامنے لے آئیگا۔

منبر سے صدیق اکبرؓ کی زبان سے یہ پیغامِ خداوندی سامنے آیا۔ مخاطب صحابہؓ کی جماعت تھی۔ وہ تو وفورِ جذبات کا عالم تھا جس سے طبائع پر اضطرابی کیفیت چھا گئی تھی اور تشکیلِ نظام کے بعد مرکزِ نظام کی پہلے پہل گم گشتگی تھی جس کی وجہ سے کچھ گھبراہٹ پیدا ہو گئی تھی۔ جونہی توجہات کو قرآن کی طرف منعطف کرا دیا گیا سارا اضطراب، سکون میں بدل گیا۔ صحابہؓ کی جماعت اٹھی اور سب سے پہلے قرآن کا منشا پورا کرنے کے لئے، نصبِ مرکزیت کے لئے جانبِ سقیفہ بنی ساعدہ روانہ ہو گئی۔ رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ

یہ آیۂ جلیلہ درحقیقت اسلامی نظام کا نقطہ ماسکہ اور قرآن سے پہلے اور بعد کے زمانے میں حدفاصل ہے۔ قرآن سے پہلے زمانے میں کیفیت کیا تھی؟ انسانی ذہن، اجتماعی نظام کے تصور سے بیگانہ تھا۔ معاشرہ کے نظم ونسق اور مملکت کے ربط وضبط کا سارا مدار افراد پر ہوتا تھا۔ سپہ سالار قتل ہوگیا تو فوج کو شکست ہوگئی۔ بادشاہ مارا گیا تو حکومت کا تختہ الٹ گیا۔ لیڈر گرفتار ہوگیا تو قوم غلام بن گئی۔ افراد کی تمام قوتیں ایک فرد کی ذات میں مرتکز سمجھی جاتی تھیں، اس کی زندگی سے سب کی زندگی اور اس کی موت سے سب کی موت ہوتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اُس دور میں افراد کی پرستش ہوتی تھی۔

قرآن نے آکر بتایا کہ قوم کے نظم ونسق اور مملکت کے ربط وضبط کا راز افراد میں نہیں بلکہ نظام میں ہے۔ حقیقی وجود جماعت کا ہے، فرد کا نہیں۔ اور جماعت نام ہے ان افراد کی یک جہتی اور ہم آہنگی کا جو ایک ضابطۂ آئین کے مطابق زندگی بسر کرنے کا عہد کر چکے ہوں۔ افراد آتے ہیں اور جاتے ہیں، لیکن جب تک جماعتی نظام قائم رہتا ہے، افراد کے آنے اور جانے کا اس پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ اس لئے نہ تو کسی فرد کے چلے جانے سے اس قوم کا کاشانۂ دل برباد ہوجاتا ہے، اور نہ ہی کسی فرد کے آجانے سے اس کی اجڑی ہوئی بستیاں آباد ہوجاتی ہیں۔ ان کی آبادی اور بربادی ان کے نظام سے وابستہ ہوتی ہے۔ جب تک وہ نظام پُروقار حیثیت سے قائم ہے، ان کی تمام بستیاں آباد ہیں۔ جب اس نظام میں خلل آجائے تو وہ تمام بستیاں قبرستانوں میں بدل جاتی ہیں جہاں سانس لینے والے مردے دفن ہوتے ہیں۔ اس نظام کے قیام کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک ضابطۂ آئین عطا کیا ہے۔ جسے قرآن کہا جاتا ہے۔ اس ضابطہ کے مطابق نبی اکرمؐ نے اس نظام کی تشکیل فرمائی۔ نظام کے مطابق، اجتماعی زندگی کا یہ پہلا نقشہ تھا جو لوگوں کے سامنے آیا۔ اس لئے اس کے اصول ومبانی نہایت واضح الفاظ میں دہرا دہرا کر ان کے سامنے لائے گئے تاکہ وہ نظام کی اجتماعی زندگی اور افراد کی زندگی میں کھلے طور پر تمیز کر سکیں۔ نظام کے قیام کا راز، مرکزِ نظام کی اطاعت میں مضمر ہوتا ہے۔ اور چونکہ رسول اللہؐ اس نظام کے اولیں مرکز تھے، اس لئے قرآن نے بار بار، نہایت شدت وتکرار کے ساتھ، رسولؐ کی اطاعت کی تاکید کی۔ "اطیعوا الرسول" (اطاعت رسول) کا یہی حکم ہے جو قرآن میں بار بار ہمارے سامنے آتا ہے۔ حتیٰ کہ یہاں تک بھی فرما دیا کہ فلا وربک لا یومنون حتیٰ یحکموک فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجاً مما قضیت ویسلموا تسلیماً (۶۵)۔ تمہارا رب (جس کے آئین کے مطابق تم نے یہ نظامِ ربوبیت قائم کیا ہے) اس حقیقت پر شاہد ہے کہ یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہوسکتے جب تک ایسا نہ کریں کہ اپنے تمام اختلافی امور میں تمہیں (اے رسول) حکم بنائیں۔ اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ان کے دلوں کی حالت یہ ہوجائے کہ جو کچھ تم فیصلہ کرو اس کے خلاف کسی طرح کی دل گرفتگی محسوس نہ کریں اور اس فیصلہ کے مطابق سب قدم ملا کر چلنا شروع کر دیں۔" کہیں یہ فرمایا کہ النبی اولیٰ بالمومنین من انفسھم۔ ۔ ۔ ۔ "مومنین کی ذات پر نبی کا حق خود ان کی اپنی ذات سے بھی زیادہ ہے" لیکن اس کے ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں ہونے دیا کہ یہ اطاعت اور محکومیت محمدؐ کی ذات کی نہیں ہے، بلکہ اس ضابطۂ قوانین کی ہے جس کے مطابق اس نظام کی تشکیل ہوئی ہے۔

ما کان لبشر ان یوتیہ اللہ الکتاب والحکم والنبوۃ ثم یقول للناس کونوا عبادا لی من دون اللہ۔ ولکن کونوا ربانیین بما کنتم تعلمون الکتاب وبما کنتم تدرسون۔ (۳/۷۹)

کسی انسان کے لئے یہ بات سزاوار نہیں کہ اللہ اسے کتاب، حکومت اور نبوت عطا فرمائے اور پھر اس کا شیوہ یہ ہو کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا سے ورے ہی میری محکومیت اختیار کرو۔ نہیں! بلکہ اس کی دعوت یہ ہونی چاہئے کہ تم سب مل کر ربانی (اللہ کے نظامِ ربوبیت کے حامل) بن جاؤ۔ اور اس کا ذریعہ ہے وہ ضابطۂ قوانین جس کی تمہیں تعلیم دی جاتی ہے اور جسے عملی تشکیل کے ذریعے تمہارے دلوں میں نقش کیا جاتا ہے۔

رسول خود بھی اس نظام کی اطاعت کرے گا اور دوسروں سے بھی اسی کی اطاعت کرائیگا۔ جب وہ اپنے مقصد کی تکمیل کے بعد دنیا سے چلا جائے گا تو اس کی جگہ اس کا جانشین لے لیگا اور وہ بھی اسی طرح اس نظام کو چلائیگا۔ ھی حتی مطلع الفجر۔ انسانی تاریخ میں یہ تصور نیا تھا (بجز حضرات انبیاء کرام کی تعلیم کے) اس لئے قرآن نے اپنے صفحات میں اور رسول نے اپنے اعمالِ حیات میں، اس کی حقیقت کو نہایت واضح الفاظ اور نمایاں انداز سے کھول کر سامنے رکھ دیا۔ اسی حقیقت کی نقاب کشائی مقصود تھی اس آیۂ جلیلہ میں جسے حضرت صدیق اکبرؓ نے برسرِ منبر دہرایا اور جس کی طرف نگاہوں کا رخ پھیرنے سے، جماعتِ مومنین نے، رسول اللہؐ کی تجہیز و تکفین سے بھی پہلے، نصبِ امامت کے فریضے کی تکمیل کی۔

قرآن نے تو یہ کچھ کیا۔ لیکن عجمی قوتوں نے قرآنی نظام کی اس حقیقت کو نگاہوں سے اوجھل کر کے، مسلمانوں کو پھر سے، نظام کی جگہ، افراد کے آسروں کا محتاج بنا دیا اور اس طرح یہ جماعتی نظام، پھر سے ملوکیت کے شخصی انتظام میں بدل گیا۔ اب پھر قوتوں کا مرکز نظام نہیں بلکہ فرد قرار پا گیا۔ اس لئے اطاعت بھی، آئینِ نظام کی جگہ افراد کی ہونے لگی۔ "دنیاوی امور" بادشاہوں نے اپنی اطاعت کے لئے مخصوص کر لئے۔ "دینی امور" (یعنی امورِ مذہب) میں، اربابِ شریعت و طریقت نے اپنی پرستش شروع کرا دی۔ کسی نے سجود اطاعت کے لئے کسی امام کا سنگِ آستاں منتخب کر لیا، کسی نے کسی فقیہ کی بارگہِ مشیخت۔ اسی افراد پرستی کا نتیجہ تھا کہ قرآن نے جہاں جہاں اطاعتِ رسول کا ذکر کیا تھا، اسے، اطاعتِ مرکزِ نظام کی بجائے، ذاتِ محمدؐ کی اطاعت سمجھ لیا گیا۔ لیکن محمدؐ تو وفات پا چکے تھے۔ اب ان کی اطاعت کس طرح کی جائے؟ اس کے لئے یہ سوچا گیا کہ حضورؐ کی طرف منسوب کردہ روایات کو جمع کیا جائے اور ان کی اطاعت کا نام اطاعتِ رسول رکھ لیا جائے۔ یعنی بجائے اس کے کہ یہ سوچا جاتا کہ وہ نظام پھر سے کس طرح قائم کیا جائے جس میں مرکز کی اطاعت "خدا اور رسولؐ کی اطاعت قرار پاتی تھی، نگاہ کا رخ اس طرف پھر گیا کہ خدا کی اطاعت سے مراد ہے قرآن کی اطاعت اور رسول کی اطاعت سے مفہوم ہے ذاتِ محمدی کی اطاعت۔ اس طرح اطاعتِ ذاتِ محمدی کی ضرورت وضع کر کے، اس کے لئے سامانِ اطاعت (روایات) اکٹھا کئے جانے لگا۔

ز ذوقِ بندگی پروردگارے کردہ ام پیدا

غرضیکہ نظام کا قرآنی تصور بدلنے سے، ساری قوم تشتت وخلفشار کے انفرادی تصورات میں کھو گئی اور اس طرح ان کی حالت وہی ہوگئی جو قرآن سے پہلے دنیا کی عام حالت تھی۔ دوسری قوموں نے ساتویں صدی عیسوی (یعنی عہد محمد رسول اللہ والذین معہٗ) کی تاریخ (اور قرآن کے اصولوں سے غیر شعوری طور پر) متاثر ہو کر رفتہ رفتہ انفرادی زندگی سے اجتماعی نظام کی طرف قدم اٹھانے شروع کئے، لیکن جس قوم کی تاریخ سے دنیا یہ سبق سیکھ رہی تھی، وہ قوم خود انفرادیت کے جہنم میں آگے ہی آگے بڑھتی گئی۔ چنانچہ آج ساری دنیا کے مسلمان اسی انفرادیت کے عذاب میں ماخوذ ہیں۔ کہیں کھلی ہوئی ملوکیت کی شکل میں اور کہیں جمہوریت کے نقاب میں چھپی ہوئی افراد پرستی کی صورت میں۔ ان کی توجہات کے مرکز، ان کی زندگی کے سہارے، ان کی قوتوں کے سرچشمے اور ان کی اطاعتوں کے معبود بہرحال افراد ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ کہ جب ان میں سے کوئی فرد بھی اٹھ جاتا ہے تو ساری قوم اس بیوہ کی طرح مصروف آہ وبکا ہو جاتی ہے جس کا سہاگ لٹ گیا ہو اور دنیا میں اس کا کوئی آسرا باقی نہ رہا ہو۔ اور جب اس کی جگہ دوسرا فرد آجاتا ہے تو وہی صف ماتم جملۂ عروسی بن جاتی ہے اور نوحۂ غم نغمۂ شادی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ایک ہی ثانیہ پہلے جس جانے والے کے متعلق کہا جاتا تھا کہ اس کا پیدا کردہ خلا کبھی بھرا نہیں جا سکتا، جو کرسی وہ خالی کر گیا ہے وہ اب ہمیشہ کے لئے خالی رہے گی۔ مادر گیتی ایسا سپوت پھر نہیں پیدا کر سکے گی۔ نقش عہد کہن بن جاتا ہے اور وہ تمام قصائد جو جانے والے کی شان میں کہے جا رہے تھے اس آنے والے کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں اور ہر طرف سے تحسین وتبریک کے غلغلوں کے ساتھ یہ آواز آنی شروع ہو جاتی ہے کہ

آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا
آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک؟

نظام کی زندگی میں نہ کسی جانے والے کی موت، امیدوں کو یاس میں بدل دیتی ہے اور نہ آنے والے سے غلط توقعات بندھنی شروع ہوتی ہیں۔ اس میں ایسی بلند ترین شخصیت کے متعلق بھی جس سے بڑھ کر بلندی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، اس سے زیادہ کچھ نہیں سمجھا جاتا کہ وما محمدٌ الا رسول۔ قد خلت من قبلہ الرسل۔ قرن اول کی تاریخ کی کتابوں کو دیکھئے۔ ان میں (جہاں اتنے کچھ رطب ویابس کی آمیزش ہو چکی ہے) جانے اور آنے والوں کا ذکر صرف اس قسم کے الفاظ میں نظر آئے گا (خواہ ان کی شخصیت کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو)۔ سبق رسول اللہ وصلّٰی[1] ابوبکر وثلث عمر (روایت حضرت علیؓ)۔ رسول اللہ پہلے گذر گئے ان کے بعد ابوبکرؓ گئے اور پھر عمرؓ۔ حالانکہ یہ وہ شخصیتیں تھیں جن کے جانے سے،

---

[1] صلّٰی کے معنی پر غور کیجئے۔ کسی کے پیچھے جانے والا۔ یہیں سے نظام صلوٰۃ کا مفہوم سامنے آجائے گا۔ یعنی خدا کے پیچھے پیچھے چلنے والا نظام۔

آنکھوں کا نور اور دل کا سرور چلا جانا چاہیے تھا۔ لیکن چونکہ نظام قائم تھا اس لئے نہ کسی کا جانا، اس کی محکم عمارت میں کوئی تزلزل پیدا کرتا تھا نہ کسی کا آنا اس میں کسی نئے ستون کا اضافہ۔ حضرت عمرؓ کی تو یہ کیفیت تھی کہ جہاں انھوں نے دیکھا کہ کسی ایک منتظم (عامل یا سپہ سالار) کی ذاتی خوبیوں سے افراد زیادہ متاثر ہو رہے ہیں، اسے وہاں سے بدل کر کسی کم منصب پر متعین کر دیا تاکہ لوگوں کے دلوں میں یہ خیال راسخ نہ ہونے پائے کہ نظم و نسق کی خوبی کا راز فلاں فرد کی ذاتی قابلیت میں ہے۔ وہ لوگوں کے دلوں سے افراد کی اہمیت کا تصور نکال کر نظام کی اہمیت کو منقوش کرنا چاہتے تھے۔ لا الٰہ الا اللہ۔ کا عملی مفہوم یہی ہے کہ قوتوں کا مرکز افراد نہیں، آئینِ خداوندی ہے۔ حتیٰ کہ اور تو اور، خود ذاتِ محمدؐ کی بھی اس باب میں صحیح پوزیشن یہ ہے کہ وہ اس آئین کے پہنچانے والے تھے۔ محمد رسول اللہ۔ اس لئے ہمارا افراد کا نہیں ہونا چاہیے، نظامِ خداوندی کا ہونا چاہیے جو حی لایموت ہے۔

افراد کے جانے کی صورت یہ ہے کہ وہ طبعی موت مر جائیں (افائن مات) یا قتل کر دیئے جائیں[1] (او قتل)۔ قتل کی صورت (میدانِ جنگ کے علاوہ) یہ ہے کہ کوئی شخص، کسی صاحبِ اقتدار کو کسی ذاتی مخاصمت کی بنا پر قتل کر دے۔ یہ قتل درحقیقت اس فرد کا ہوتا ہے، صاحبِ حکومت کا نہیں ہوتا۔ جیسے حضرت عمرؓ کا قتل کہ وہ قتل خلیفۃ المسلمین کا نہیں تھا۔ ایک فرد نے اپنی ذاتی مخاصمت کی بنا پر ایک دوسرے فرد کو قتل کر دیا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ مقتول کی ایک حیثیت خلیفۃ المسلمین کی بھی تھی۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اس شخص کو محض اس کے منصب کی بنا پر قتل کر دیا جائے۔ جیسے حضرت عثمانؓ کا قتل، کہ قاتلین کو حضرت عثمانؓ کی ذات سے مخاصمت نہ تھی بلکہ وہ ایک خلیفہ کا خاتمہ کرنا چاہتے تھے تاکہ اس کی جگہ دوسرا خلیفہ بنایا جائے۔ اس قسم کے قتل کو سیاسی قتل کہا جائے گا۔ اس کی بھی دو تین قسمیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ کوئی بیرونی حکومت سیاسی وجوہات کی بنا پر کسی کو قتل کرا دے۔ یا اپنی مملکت کی کوئی سازشی جماعت، دہشت انگیزی کے انداز سے قتل و غارت گری پر اتر آئے۔ یا کوئی فرد، بعض سیاسی جذبات سے مشتعل ہو کر کسی کو قتل کر دے۔ ان میں سے کوئی صورت بھی ہو، قرآن کی رو سے قتلِ ناحق، بہت بڑا جرم ہے۔ اتنا بڑا جرم کہ اس کے نزدیک اس کا مرتکب تمام نوعِ انسان کے قتل کا مجرم ہوتا ہے۔ فکانما قتل الناس جمیعاً (۵/۳۲) اس لئے کہ جس نظام کا مدار ہی رائے عامہ پر ہو اس میں امیرِ ملت کا انتخاب بھی رائے عامہ سے ہوگا اور اس کا عزل و تعطل بھی رائے عامہ کے ذریعے آئینی طریق پر۔ اس نظام میں نہ کوئی فرد قوت اور غلبہ سے امیر

---

[1] آئینی طور پر کسی صاحبِ امر کو الگ کر دینا ایک جداگانہ چیز ہے جس کا ذکر اس جگہ نہیں کیا گیا۔ یہ ایک مستقل مبحث ہے جس کے متعلق تفصیلاً لکھے جانے کی ضرورت ہے۔ یعنی یہ کہ کن حالات میں منتخب شدہ امیرِ امت کو معزول کیا جا سکتا ہے۔

بن سکتا ہے نہ منتخب شدہ امیر کو قوت اور غلبہ سے ہٹایا جا سکتا ہے چہ جائیکہ اسے قتل کر دیا جائے۔ یہ ہے قرآن کی تعلیم۔ لیکن جن لوگوں کا مقصدِ زندگی یہ ہے کہ کوئی واقعہ ہو، اس سے کسی نہ کسی طرح اسلام کو بدنام کیا جائے یا جو اسی مقصد کی بنا پر مسلمانوں کے ہر فعل کو اسلامی تعلیم کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ ان کی حالت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ یہ پروپیگنڈا کرتے رہتے ہیں کہ اسلام کی تعلیم ہی قتل و غارتگری اور خونریزی و فساد انگیزی کی ہے چنانچہ پاکستان کے وزیرِ اعظم محترم لیاقت علی خاں (مرحوم) کے سانحۂ قتل پر (جس سے ہر قلب حساس متاثر ہے) امریکہ سے آواز اٹھی کہ مسلمانوں کے مختلف ممالک میں ۱۹۰۵ء سے اس وقت تک کم و بیش تیرہ مشہور و معروف سیاسی قتل ہو چکے ہیں۔ اس سے مقصود یہ ظاہر کرنا تھا کہ اسلام، وحشت و بربریت کا مذہب ہے اور اس کے متبعین قاتل اور جلاد ہیں جنہیں تہذیب و تمدن سے کچھ واسطہ نہیں۔ انہی آوازوں کا اثر ہے کہ آپ نے خود مسلمانوں کو دیکھا ہوگا کہ وہ نگاہیں نیچے کئے، سرد آہیں بھر کر کہہ رہے ہیں کہ صاحب! بات، بالکل سچی ہے۔ تیرہ قتل کیا، ہماری تو ساری تاریخ ہی ان "کارناموں" سے بھری پڑی ہے۔ اور اس تاریخ قتل و خونریزی کی ابتدا حضرت عثمانؓ بلکہ حضرت عمرؓ کے قتل سے کر کے اس کا سرا گذشتہ ایک دو سال کے وارداتِ قتل تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ سطح بین نگاہوں کیلئے یہ امر فی الواقعہ باعثِ صد حیرت و استعجاب بن جاتا ہے کہ مسلمانوں کی ساری تاریخ اس قسم کے سیاسی قتلوں سے بھری پڑی ہے اور وہ سلسلہ آج تک جاری ہے! چونکہ ان کی سطح بینی ان تاریخی واقعات کی کوئی اور توجیہہ پیش کرنے سے قاصر ہوتی ہے اس لئے وہ یہ کہنے یا کم از کم محسوس کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ہو نہ ہو یہ اسلام کی تعلیم ہی کا اثر ہے لیکن حقیقت اس سے مختلف ہے اور جب تک اسے سامنے نہ لایا جائے، سطح بینی یا دوسروں کے پراپیگنڈے کے غلط اثرات زائل نہیں ہو سکتے۔ اسلام نے ملوکیت کے استبدادی نظامِ حکومت کی جگہ عوام کے انتخابی نظام کی تعلیم دی (جسے اس نے نظامِ شورائیت کہہ کر پکارا ہے)۔ ملوکیت اور انتخابیت میں فرق یہ ہے کہ ملوکیت، تغلب و تسلط کے ذریعے اقتدار قائم کرتی ہے اور انتخابیت میں زمامِ اقتدار، عوام کی مرضی سے، کسی کے ہاتھ میں سونپی جاتی ہے۔ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ[1] اور حضرت عثمانؓ کا انتخاب رائے عامہ کی نمائندگی کا مظہر تھا۔ طریق انتخاب میں بیشک فرق تھا لیکن روحِ نمائندگی ان تینوں میں موجود تھی۔ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں ایک جماعت نے اس خیال کو عام کیا کہ ملت کا امیر منتخب نہیں ہوتا بلکہ منصوص (خدا کی طرف سے مقرر شدہ) ہوتا ہے اسلئے انتخاب کی رو سے برسرِ اقتدار آیا ہوا امیر برسرِ حق نہیں ہو سکتا۔ برسرِ حق صرف امامِ منصوص ہوتا ہے خواہ اسے ایک رائے بھی حاصل نہ ہو اور اس کی امارت کا انکار

---

[1] جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں حضرت عمرؓ کا قتل، انفرادی اور ذاتی قتل تھا۔ سیاسی نہیں تھا۔ سیاسی قتل کی ابتدا حضرت عثمانؓ کے قتل سے ہوئی تھی۔

نبوت کے انکار کی طرح مستلزم کفر ہوتا ہے یعنی جس طرح ایک نبی اپنی نبوت کے لئے رائے عامہ کا محتاج نہیں ہوتا بلکہ وہ اسوقت بھی نبی ہوتا ہے جب اسے کوئی ایک شخص بھی نبی نہ مانے اسی طرح امام منصوص بھی اپنی امامت کیلئے رائے عامہ کا محتاج نہیں ہوتا بلکہ وہ ہر وقت امام برحق ہوتا ہے اور اس کی موجودگی میں ہر دوسرا امام (خواہ اسے متفقہ طور پر ہی منتخب کیوں نہ کیا گیا ہو) باطل پر ہوتا ہے۔ باطل پر ہی نہیں بلکہ امام برحق کو اس کے حقِ امامت سے محروم رکھنے کے جرم میں مستوجب قتل۔ اور اس کے حامی انکار امامتِ منصوص کی وجہ سے کفر کے مرتکب۔ اسی نظریہ کے ماتحت، حضرت عثمان کا قتل عمل میں آیا اور یہیں سے انتخابی خلافت کا تصور غیر انتخابی امامت میں بدل گیا۔ اس جدید تصور کی رو سے کہا یہ گیا کہ امارت، منصوص ہونے کی وجہ سے حضرت علیؓ کے گھرانے میں محدود ہو چکی ہے یعنی حضرت علیؓ کے بعد ان کی اولاد میں سے سب سے بڑا بیٹا امام منصوص ہوگا۔ آپ غور کیجئے تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آجائے گی کہ اس تصور میں اور ملوکیت میں صرف لفظی (اور اعتقادی) فرق ہے۔ بلکہ یہ امارت، ملوکیت سے بھی زیادہ محکم ہے کیونکہ کسی بادشاہ کے خلاف سرکشی سے تو زیادہ سے زیادہ دنیا میں جان کا خطرہ ہوتا ہے لیکن امام منصوص کی امامت کے خلاف لب کشائی سے ایمان بھی جاتا رہتا ہے۔ ایک فریق نے جب امارت کو اس طرح غیر انتخابی اور خاندانی بنانے کی ٹھانی تو فریق مقابل نے کہا کہ اگر امارت انتخابی نہیں بلکہ خاندانی ہے تو وہ ہمارے گھرانے میں کیوں نہ رہے؟ جب امارت اس طرح غیر انتخابی اور موروثی قرار پاگئی تو اس کا فیصلہ بھی قوت سے ہونے لگا۔ جس خاندان نے زیادہ قوت حاصل کرلی وہی حکومت کا مالک بن گیا۔ اسی کا نام ملوکیت ہے جو اسوقت سے آجتک مسلمانوں کے ملکوں میں مسلسل و متواتر چلی آرہی ہے۔ چونکہ ملوکیت کا انحصار قوت پر ہوتا ہے اور اس میں آئینی تبدیلی کی گنجائش ہی نہیں ہوتی اس لئے تبدیلی کی خواہاں جماعت (یا افراد) بھی قوت کا استعمال شروع کردیتی ہے۔ اس سے سیاسی قتل ظہور میں آتے ہیں۔ لہٰذا جسقدر کوئی نظام زیادہ انتخابی ہوگا یعنی اس میں آئینی طور پر تبدیلیاں پیدا کرنے کی گنجائش اور آسانی جس قدر زیادہ ہوگی اسی قدر اس میں سیاسی قتل اور فساد انگیزی کے واقعات کم ہوں گے۔ اگر آج مسلمانوں کے ممالک میں سیاسی قتل کے واقعات نسبتاً زیادہ ہوتے ہیں تو اس کی وجہ نہ اسلام کی تعلیم ہے اور نہ ہی اس قوم کی مبینہ "وحشت و بربریت" اس کی وجہ وہ نظامِ ملوکیت ہے جو مسلمانوں کے ممالک میں عام طور پر رائج ہے اور جس میں انتخابی تبدیلیوں کی گنجائش ہی نہیں (اور اگر کہیں ہے تو بہت کم)۔ یہ صورت حال اپنے اپنے دور میں دنیا کے ہر ایک ملک میں رہی ہے۔ یورپ کے ممالک میں جب ملوکیت کا نظام تھا تو وہاں بھی یہی حالت تھی۔ ان ممالک نے آہستہ آہستہ اپنے نظام اس طرح بدل لئے ہیں کہ ان میں آئینی تبدیلیوں کی گنجائش زیادہ ہے۔ اسی نسبت سے وہاں سیاسی قتل بھی کم ہوگئے ہیں۔ لہٰذا اس باب میں نہ تو مسلمانوں کی قوم کی مزعومہ "خوئے سفاکیت" کو دخل ہے اور نہ ہی اقوامِ مغرب کی "تہذیب و شائستگی" کا کوئی کرشمہ۔

اصل شے نظامِ مملکت کا فرق ہے۔ آئینی تبدیلیوں کے امکانات انگلستان اور امریکہ میں کم کر دیجئے، پھر دیکھئے وہاں کس کی جان سلامت رہتی ہے! اگر مسلمانوں کے ممالک چاہتے ہیں کہ ان کے ہاں سے یہ وحشت و بربریت ختم ہو تو اس کا علاج صرف یہ ہے کہ نظامِ مملکت کو زیادہ سے زیادہ عوامی (انتخابی) بنا دیا جائے۔ اب قوت کے زور پر حکومت کرنے کا زمانہ ختم ہو رہا ہے۔ یہ امر کس قدر صدمے کا موجب ہے کہ آج ملوکیت ان ملکوں میں قائم ہے جہاں کے باشندے اس دین سے نسبت کے مدعی ہیں جس نے اس زمانے میں ملوکیت کے خاتمے کا اعلان کیا جب ہنوز ساری دنیا بادشاہوں کو ایشور کا اوتار (خدا کا سایہ) سمجھا کرتی تھی!

کہا جا سکتا ہے کہ یورپ کے ممالک نے دو تین سو سال میں کہیں جا کر اپنے نظام کو بدلا ہے۔ آہستہ آہستہ۔ تدریجی طور پر۔ اسی طرح اتنا ہی وقت مسلمانوں کو اپنا نظام بدلنے میں لگے گا۔ یہ نظریہ ایک بنیادی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اقوامِ یورپ کو اپنے نظام کی تبدیلی میں اتنا وقت اس لئے لگا کہ ان کے سامنے کوئی بنا بنایا نظام نہیں تھا۔ انھوں نے کچھ روشنی تاریخ سے مستعار لی۔ اس کے بعد تجربے شروع کئے۔ ایک ایک تجربے میں سالہا سال صرف ہو گئے۔ وہ ناکام ثابت ہوا تو دوسرا تجربہ شروع کر دیا۔ اس طرح کی تدریجی تبدیلیوں میں جسقدر وقت، محنت اور ایضاعِ مال و جان ہو گا وہ ظاہر ہے۔ لیکن مسلمانوں کے پاس تو نظامِ شورائیت بنا بنایا رکھا ہے۔ انھیں اس نظام کو فقط اختیار کرنا ہو گا۔ ذاتی اور عقلی تجارب سے کوئی نظام وضع نہیں کرنا ہو گا۔ اس لئے جس مقام پر دنیا کی اور قومیں صدیوں میں پہنچی ہیں یہ پہلے ہی قدم میں اس سے بھی کہیں آگے پہنچ سکتے ہیں۔

عشق کی اک جست نے طے کر دیئے قصے تمام
اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں

ہمیں یقین ہے (اور اس یقین کی بنا پر پاکستان کا استحکام ہمارا مقصودِ حیات ہے) کہ اس باب میں پاکستان عالمِ اسلام کی امامت کر سکتا ہے۔ اور اس کے بعد ساری دنیا کی قیادت۔ اس کا طریقہ ایک ہی ہے کہ حکومت کو زیادہ سے زیادہ نمائندہ بنایا جائے۔ (صرف انہی معنوں میں نمائندہ نہیں جن معنوں میں مغرب کا نظامِ جمہوری دعویٰ نمائندگی کرتا ہے۔ بلکہ ان معنوں میں نمائندہ جو قرآن کا مفہوم و منطوق ہیں۔ جس میں ہر فردِ مملکت یہ محسوس کرنے لگے۔ جانتا ہے کہ حکومت میری اپنی ہے اور میں کسی کا محکوم نہیں) اس میں شبہ نہیں کہ ہماری مملکت کی تاسیس دعوئے جمہوریت پر ہوئی ہے

لیکن یہ ایک حقیقت ہے جس سے اغماض نہیں کیا جا سکتا کہ اس وقت تک مملکت کی صحیح نمائندگی کے لئے کوئی اقدام نہیں ہوا۔ ہمارے ہاں دستور ساز اسمبلی بھی ہے (اور وہی مجلس مقننہ بھی) لیکن ذرا سوچئے کہ وہ اسمبلی کس کی نمائندہ ہے؟ اس اسمبلی کا انتخاب، پاکستان بننے سے پہلے، ہندوستان میں ہوا تھا۔ لیکن ہندوستان میں بنی ہوئی اسمبلی کو پاکستانی مسلمانوں کی نمائندہ جماعت کہا جا سکتا ہے؟ جہاں جدید انتخابات ہوئے ہیں وہاں کے عوام (صحیح یا غلط طور پر) یہی محسوس کرتے ہیں کہ انتخابات ان کی نمائندگی نہیں کرتے۔ کہا جا سکتا ہے کہ عوام کے ان (غلط) احساسات کا کیا علاج! لیکن اس کا علاج ہے۔ ہم متعدد بار اس حقیقت کو اجاگر کر چکے ہیں کہ ہمارے ہاں حکومت اور عوام میں کوئی رابطہ نہیں رہا۔ عوام اپنے آپ کو الگ سمجھتے ہیں اور ارباب حکومت کو اپنے سے الگ۔ اس کی ذمہ داری ارباب حکومت پر ہے جنہوں نے عوام سے حقیقی رابطہ قائم رکھنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ حکومت اور عوام میں اس قسم کا بُعد اچھا نہیں ہوتا۔ اس خلیج کو پاٹنے کی اشد ضرورت ہے اور بہت جلد۔ اسی خلیج کا نتیجہ ہے کہ حکومت، عوام کے دل کی دھڑکنوں سے ناآشنا رہتی ہے۔ حکومت کا ذریعۂ معلومات یا تو اپنے پرچہ نویسوں (سی۔آئی۔ڈی) کی رپورٹیں ہوتی ہیں یا پریس کی اطلاعات۔ اول الذکر ذریعہ جس قدر قابلِ اعتماد ہو سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔ دورِ حاضرہ میں، پریس یقیناً ایک قابلِ اعتماد ذریعہ بن سکتا ہے، لیکن ہمارے ہاں پریس کی جو حالت ہے، وہ سب پر روشن ہے۔ پریس، یا تو ارباب بست وکشاد کی "مصاحب گیری" کرتا رہتا ہے جس میں انداز یہ ہوتا ہے کہ

ہمیں تو خوبے کہ جو کچھ کہو بجا کہئے

اور اگر کوئی ارباب اقتدار کی مخالفت کرتا ہے تو وہ یا تو ذاتی ہوتی ہے۔ یا پارٹی بازی کی کشاکش۔ لہٰذا حقیقتِ حال نہ موافقین کے ذریعے معلوم ہو سکتی ہے نہ مخالفین کے۔ صورتِ حال یوں ہے کہ عوام سے رابطہ نہ رکھنے کی وجہ سے اربابِ اقتدار براہ راست یہ معلوم ہی نہیں کر سکتے کہ عوام کے احساسات کیا ہیں۔ اور ان کے ذرائع علم انہیں کبھی یہ نہیں بتاتے کہ

کہتی ہے ان کو خلقِ خدا غائبانہ کیا

ارباب اقتدار نے عوام سے ربط وضبط کا ذریعہ مسلم لیگ کو قرار دے رکھا ہے۔ تشکیل پاکستان کے بعد ہم نے

سب سے پہلے اس حقیقت کی وضاحت کی تھی کہ جس مقصد کے لئے، ہندوستان میں مسلم لیگ کو تشکیل کیا گیا تھا وہ مقصد پورا ہو چکا ہے۔ پاکستان میں تمام مسلمان ایک جماعت کے افراد ہیں۔ اس لئے یہاں مسلم لیگ کسی فائدے کے بجائے ملت میں تشتت و افتراق کا موجب بن جائے گی۔ چار سال کے تجربے نے اس حقیقت کے ایک ایک حرف کو صحیح ثابت کر دیا۔ اس وقت ملک جس پارٹی بازی کا تختۂ مشق بن رہا ہے، اس کا بیج مسلم لیگ نے بویا تھا۔ ارباب حل و عقد جتنی جلدی اس حقیقت کا احساس کر لیں گے، ملک کے لئے اتنا ہی مفید ہوگا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ مسلم لیگ کو ختم کر دیا جائے اور اس کے ساتھ ہی ہر پارٹی کو ممنوع قرار دیدیا جائے۔ تمام امور نظم و نسق ملتِ واحدہ کے اصول پر طے پائیں نہ کہ پارٹی بازی کے شجرِ خبیثہ کی بنیادوں پر۔ لیکن اگر ارباب بست و کشاد اپنے مصالح کے پیشِ نظر، ایسا کرنا مناسب نہ سمجھیں تو ملک میں حزبِ مخالف کی تشکیل و تدوین کے لئے آسانیاں بہم پہنچائی جائیں۔ یہ راہ قرآنی اصولوں کے خلاف تو ہوگی لیکن کم از کم مغرب کے اصولِ جمہوریت کے تو مطابق ہوگی جس کی اتباع اس وقت یہاں کی جا رہی ہے۔

تو اگر اس کا نہیں بنتا، نہ بن، اپنا تو بن!

لیکن یہ سب کچھ بیکار ہے جب تک ملک میں اپنا آئین نافذ نہیں کیا جاتا۔ اس وقت تک پاکستان میں وہی انگریز کا بنایا ہوا آئین (گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء) نافذ العمل ہے۔ حتیٰ کہ حالت یہ ہے کہ دنیا کی اس سب سے بڑی اسلامی مملکت کے رئیسِ جمہوریہ (گورنر جنرل) کا تقرر بھی حضور ملکِ معظم سلطنتِ برطانیۂ کبریٰ کی منظوری سے ہوتا ہے۔ یہ ایک رسم ہی سہی۔ لیکن کبھی کسی نے اس کا بھی احساس کیا ہے کہ اس رسم سے عوام کے جذبات پر کیا گذرتی ہے؟ ایسے بھی یہ چلمنی آزادی بالآخر کب تک؟ اور پھر یہ بھی سوچئے کہ یہ رشتۂ مودت ہے کس سے؟ اُس انگریز سے جو ساری عمر مسلمانوں کا بدترین دشمن رہا ہے اور آج بھی ممالک اسلامیہ اس کے پنجۂ استبداد اور مہرہ بازیٔ سیاست کے ہاتھوں کچلے چلے جا رہے ہیں۔ ان سے امید و وفا رکھنا خود فریبی نہیں تو اور کیا ہے۔ اور پھر اس قوم کے تو خود بھی بہار کے دن ختم ہو چکے ہیں۔ ان سب امور کا علاج اپنے آئین کی تشکیل و تنفیذ ہے۔ لیکن یہ آئین اسی صورت میں فوز و فلاح کا ضامن ہو سکتا ہے جب یہ قرآنی نظامِ ربوبیت کا حامل ہو جس میں ہر فرد مملکت کی ربوبیت (پرورش اور جملہ صلاحیتوں کی نشوونما) کا ذمہ دار، نظامِ مملکت ہوتا ہے۔ اب دنیا میں، اس

قرآنی نظامِ ربوبیت کے علاوہ کسی اور نظام کے لئے قیام وبقا ممکن نہیں۔ جہاں خدا کا یہ نظامِ ربوبیت نافذ نہ کیا گیا وہاں ابلیس اس کی نقل اتار کر اپنا نظام مسلط کر دے گا۔ اس لئے کہ اس کے نزدیک ــــ مزدکیت فتنۂ فردا نہیں اسلام ہے ــــ اس باب میں اگر پاکستان نے صحیح قدم اٹھا لیا تو ہم پورے حتم ویقین سے کہہ سکتے ہیں کہ دنیا کی امامت اس کے لئے وقف ہوگی۔ اس راہ میں نہ تو دوسری مملکتوں سے ہمارے سیاسی تعلقات کو عناں گیر ہونا چاہیئے اور نہ ہی مُلّا کی ملوکیت پرستی کو مزاحم۔ ہم مُلّا کا نام بار بار لیتے چلے آرہے ہیں اور اب بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے اسلئے کہ ہمارے نزدیک ملائیت کسی صورت میں بھی افرنجیت سے کم ضرر رساں نہیں۔ بلکہ بعض اسالیب سے تو یہ اس سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ پاکستان میں افرنجیت کی جگہ مُلّائیت کو نصب کرنے کی تحریکیں بہت زور شور سے سرگرم عمل ہیں اور ہماری بدقسمتی سے اس کے لئے بعض عناصر کی وجہ سے حالات بھی سازگار ہیں۔ لیکن ہم اس حقیقت کو کھول کر کہہ دینا چاہتے ہیں کہ ابلیس نے اگر اپنے لئے "فتنۂ اسلام" کو فتنۂ مزدکیت سے زیادہ خطرناک بتایا تھا تو اس فتنے سے بچنے کے لئے یہی راہ تجویز کی تھی جس کی تبلیغ مُلّا کر رہا ہے کہ

مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

اگر مسلمان نے اس آواز کو نہ سنا تو پاکستان کا وہی حشر ہو جائے گا جو اس وقت باقی ممالک اسلامیہ کا ہو رہا ہے اس خطرے سے بچنے کا طریق صرف قرآن کے نظام کو اختیار کرنے میں ہے۔ اس نظام کے اصولی خط وخال اس مسودۂ دستور اساسی میں موجود ہیں جو طلوع اسلام کی طرف سے مجلس آئین ساز کو بھیجا جا چکا ہے (اور جو غالباً صدا بصحرا بن کے رہ گیا ہے) اس آئین کے مطابق وہ نظام متشکل ہو سکے گا جس میں افرادِ مملکت یہ محسوس کریں گے کہ وہ کسی کے محکوم نہیں، اس لئے اس نظام کی اطاعت میں انھیں کسی کبیدگی اور دل گرفتگی کا احساس نہیں ہوگا۔ اس میں افرادِ مملکت اور ارباب نظم ونسق ایک ہی برادری کے اعیان وارکان اور ایک قافلہ کے ہمرہاں دکھائی دیں گے۔ اس میں ملت کے تمام تفرقے مٹکر ساری امت، امتِ واحدہ بن جائے گی۔ اس میں تمام افرادِ مملکت کے مضمر جوہروں کے کامل طور پر نشوونما پانے کے اسباب وذرائع ہر ایک کے لئے یکساں طور پر موجود ہوں گے۔ اس میں نہ داخلی فساد انگیزیوں کا کوئی خوف ہوگا نہ خارجی وسیہ کاریوں کا کوئی خطرہ۔

یہی وہ نظام ہوگا جس میں انسانیت اپنے پاؤں پر کھڑی ہو جائے گی اور زمین اپنے پرورش دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔ اس وقت ساری دنیا کی قیادت، مملکت پاکستان کی امتِ وسطیٰ کے ہاتھ میں ہوگی۔ کیسا وجد آور دن ہوگا وہ سماں اور کیسی سہانی ہوگی وہ گھڑی۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔ ہماری اس دعوت کی انتہا یہ ہوگی کہ پرورش و ربوبیت اور حسن و جمال کا سرچشمہ ایک ہوگا۔ یعنی اللہ کا قانون۔

طلوع اسلام کے قارئین کے متعلق ہمیں اتنا اندازہ تو تھا کہ ان کا رسالے سے اتنا ہی تعلق نہیں جتنا ایک خریدار کا ایک کتاب یا پرچے سے تعلق ہوتا ہے، لیکن ہمیں اس کا صحیح اندازہ نہ تھا کہ اس قسم کا تعلق رکھنے والوں کا حلقہ کتنا بڑا ہے۔ پچھلے پرچے میں ناگزیر حالات کی بنا پر طلوع اسلام کی اشاعت کے التوا کی خبر شائع ہونے پر جو تاثرات ہم تک پہنچے ہیں ان سے اس امر کا اندازہ ہوا کہ قارئین طلوع اسلام میں سے قریب قریب ہر ایک کا تعلق اسی قسم کا ہے۔ وہ اس پرچے کو ایک ماہوار جریدہ نہیں سمجھتے بلکہ ایک ایسی تحریک کا نقیب تصور کرتے ہیں جس کے وہ خود بھی رکن ہیں۔ چنانچہ ان سب کی طرف سے بیک زبان (الفاظ کے اختلاف کے ساتھ) یہی ردِ عمل موصول ہوا کہ طلوع اسلام کی اشاعت میں انقطاع (خواہ عارضی ہی کیوں نہ ہو) ان کی تحریک کی پسپائی کے مرادف ہے جسے وہ کبھی بطیب خاطر گوارا نہیں کر سکتے۔ ہم طلوع اسلام کو شروع سے ایسا ہی سمجھتے چلے آرہے ہیں۔ ہمارے سامنے قرآن کا پیش کردہ ایک واضح نظام ہے اور طلوع اسلام اس نظام کے تصورات کو عام کرنے کا ذریعہ ہے۔ لیکن اس سے ہمیں بڑی تقویت ہوئی اور دلی مسرت کہ طلوع اسلام کی یہ حیثیت صرف ہمارے نزدیک ہی نہیں بلکہ اس کے قارئین کا پورے کا پورا نہیں تو کم از کم معتد بہ حصہ ہمارا ہم نوا ہے۔

جیسا کہ ہم نے اشاعت سابقہ میں لکھا تھا، ہم نے طلوع اسلام کی اشاعت کے التوا کا فیصلہ کچھ ہنسی خوشی نہیں کر دیا تھا۔ یہ آنسو بھر کر سرمژگاں اسی وقت چھلکے تھے جب ان کا مینائے قلب میں لوٹانا ناممکن ہو چکا تھا۔ ہمیں اس سے بھی خوشی ہوئی کہ ہمارا یہ غم تنہا ہمارا غم ہی نہیں، اس میں ہمارے بہت سے غمگسار شریک ہیں۔ غم گساروں کی شرکت سے غم بٹ جایا کرتا ہے۔ قارئین کی طرف سے طلوع اسلام کو جاری رکھنے کے لئے قسم قسم کی تجاویز موصول ہوئیں۔ بہت سی ایسی بھی جو اضطرابی کے عالم میں محض جذبات پر مبنی ہوتی ہیں۔ ان کے خلوص

میں شبہ نہیں ہوا کرتا لیکن ان سے اصل مسئلے کا حل بھی تو نہیں ملا کرتا۔ کچھ تجاویز ایسی بھی ہیں جنھیں (Concrete) کہا جا سکتا ہے۔ ہم ان میں سے ایک ایک تجویز پر پوری توجہ دے رہے ہیں۔ لیکن ان سطور کے لکھنے کے وقت تک ان تجاویز کی مجموعی حیثیت ایسی نہیں ہو سکی جن سے طلوع اسلام مستحکم بنیادوں پر قائم ہو سکے۔ ابھی مزید تجاویز موصول ہو رہی ہیں، اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی روشنی میں آخری صورت کیا ہوگی۔ ہمارا خیال ہے کہ ہم طلوع اسلام کی آئندہ ماہ کی شاعت تک اس قابل ہو سکیں گے کہ احباب کو بتا سکیں کہ ان تجاویز کا آخری نتیجہ کیا ہوا۔ ایک بات ایسی ہے جس کا ابھی سے اعلان کیا جا سکتا ہے۔ بہت سے احباب نے عطیات کی پیشکش بھی کی ہے۔ ہم ان کے خلوص اور رفاقت کے بدل شکر گذار ہیں لیکن ہم معذرت خواہ ہیں کہ ہم اس قسم کے پیشکش کردہ عطیات کو قبول نہیں کر سکتے۔ ہمیں توقع ہے کہ ہمارے اس طرز عمل سے اگر کسی دوست کی دلشکنی ہو تو وہ ہم کو معاف کر دیں گے۔

اس ضمن میں ہمیں اس قدر خطوط موصول ہوئے کہ ان کا الگ الگ جواب دینا ہمارے لئے مشکل ہے، اگرچہ ہماری دلی خواہش تھی کہ ان مخلص احباب کا فرداً فرداً شکریہ ادا کریں۔ ان حضرات سے درخواست ہے کہ وہ انہی سطور کو اپنے خطوط کا جواب تصور فرمالیں۔

نوادرات

(مجموعہ مضامین علامہ اسلم جیراجپوری)

بڑا سائز۔ ضخامت ۴۰۰ صفحات ـــــ قیمت مجلد چار روپے ـــــ محصول ڈاک علاوہ

معراج انسانیت (معارف القرآن - جلد چہارم)

سیرت صاحب قرآن ـــــ قرآن کے آئینے میں

(قیمت بیس روپے) دو ماہ کے لئے رعایتی قیمت بارہ روپے ـــ علاوہ محصول ڈاک

تاریخ رسالت (معارف القرآن - جلد سوم)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پیشتر کے انبیائے کرامؑ کی دعوات انقلاب کا تذکرہ

(قیمت پندرہ روپے) دو ماہ کے لئے رعایتی قیمت دس روپے ـــ علاوہ محصول ڈاک۔

ادارۂ طلوع اسلام - رالسن روڈ - کراچی

نظریۂ ارتقاء اور قرآن

پرویز

طلوع اسلام کی سابقہ اشاعت میں میرا مضمون بہ عنوان "نجات" شائع ہوا جس میں ضمناً نظریۂ ارتقاء کی طرف بھی اشارہ آگیا تھا۔ قارئین میں سے اکثر احباب نے کہا ہے کہ مجھے نظریۂ ارتقاء کے متعلق ذرا تفصیل سے لکھنا چاہئے کیونکہ اس کے بغیر خود نجات کے متعلق قرآنی نظریہ جسے میں نے پیش کیا ہے تشنۂ تکمیل رہ جاتا ہے۔ مجھے اس سے اتفاق ہے لیکن میں نظریۂ ارتقاء کے متعلق اس سے قبل تفصیل سے لکھ چکا تھا اس لئے اس کی ضرورت نہ سمجھی۔ چنانچہ طلوع اسلام کے سابقہ دور کے مضامین کے علاوہ معارف القرآن کی دوسری جلد میں اس عنوان پر مفصل بحث آچکی ہے۔ بایں ہمہ چونکہ قارئین میں سے اکثر وہ ہیں جنھوں نے سابقہ دور کے طلوع اسلام کے مضامین نہیں دیکھے اور معارف القرآن کی دوسری جلد سردست نایاب ہے، اس لئے میں نے ضروری سمجھا ہے کہ اس عنوان پر ملخصاً طلوع اسلام میں کچھ شائع کر دیا جائے۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

قرآن سے پہلے دنیا بالواسطہ یا بلاواسطہ، مفکرینِ یونان کے نتائج فکر سے متاثر تھی۔ اس فلسفہ کی رُو سے کائنات کا تصور سکونی (Static) تھا یعنی یونان کے فلاسفر یہ کہتے تھے کہ کائنات کسی وقت خدا کے ہاتھوں سے مکمل شکل میں وجود میں آگئی تھی اور اب ایک بے جان ڈلے کی طرح فضا کی پہنائیوں میں چپ چاپ پڑی ہے۔ نہ اس میں کوئی حرکت ہے نہ اضافہ، نہ تغیر ہے نہ تبدل۔ اسے جو کچھ بننا تھا بن چکی۔ جو کچھ ہونا تھا ہو گیا۔ اس کا نام تھا کائنات کا سکونی تصور یعنی یکسر ساکت و ساکن کائنات۔

قرآن نے اس نظریہ کا ابطال کیا اور کہا کہ کائنات کا تصور سکونی نہیں بلکہ حرکیاتی (Dynamic) ہے۔ ہیولائے کائنات ایک بننے والی شے کے خمیر کی شکل میں وجود میں آیا اور اب کائنات مسلسل تغیر و تبدل سے اپنی ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی اپنے منتہیٰ کی طرف بڑھتی جا رہی ہے۔ خالقِ کائنات اس ہیولاء کو وجود میں لانے کے بعد معطل ہو کر نہیں بیٹھ گیا بلکہ وہ اس میں نت نئے اضافے کرتا رہتا ہے۔ یزید فی الخلق ما یشاء (۳۵/۱) وہ اپنے قانونِ مشیت کے مطابق، مخلوق میں برابر اضافہ کرتا رہتا ہے۔ صرف اضافہ ہی نہیں بلکہ ایسا تغیر و تبدل کہ ہر وہ شے جو رکھے جانے کے قابل نہیں رہتی اسے مٹا دیا جاتا ہے اور جس میں باقی رہنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیت ہوتی ہے اسے مستحکم کر دیا جاتا ہے۔ یمحوا اللہ ما یشاء و یثبت (۱۳/۳۹)۔ مٹایا اسے جاتا ہے جس کا نتیجہ منفیانہ (یا تخریبی ہو)۔ اسے قرآن کی اصطلاح میں باطل کہا جاتا ہے اور قائم اسے رکھا جاتا ہے جس کا اثر تعمیری ہو۔ اسے حق کہتے ہیں۔

سورۂ شوریٰ میں ہے:

ویمح اللہ الباطل ویحق الحق بکلمٰتہ (۴۲/۲۴)

خدا اپنے قانون مشیت کے مطابق، تخریبی عناصر کو مٹا دیتا ہے اور تعمیری عناصر کو مستحکم کرتا ہے۔

کائنات میں یہ سلسلۂ تغیر و تبدل، یہ عملِ محو و تثبیت کچھ ایسے غیر محسوس انداز سے عمل میں آرہا ہے کہ سطحی آنکھ اس تماشائے تحول و تدرج سے بہرہ یاب نہیں ہو سکتی۔ پھر یہ تبدیلیاں اتنے طول طویل عرصوں کے بعد ظہور میں آتی ہیں کہ انسانی یادداشت کے لئے اس کا ریکارڈ رکھنا مشکل ہے، اس لئے محققین و مکتشفینِ علوم طبیعی کو ان تدریجی انقلابات کے لئے خود صحیفۂ فطرت کے اوراق اور خزائن و دفائن ارضی کے نقوش و آثار کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ قرآن نے کائنات کے ان تدریجی مراحل کے متعلق ایک اصول بیان کیا ہے جو اس بحث کا نقطۂ ماسکہ ہے۔ وہ کہتا ہے:

یدبر الامر من السماء الی الارض۔ ثم یعرج الیہ فی یوم کان مقدارہ الف سنۃ مما تعدون۔ ذالک عالم الغیب والشہادۃ العزیز الرحیم۔ (۳۲/۵)

اللہ ایک امر (اسکیم) کی تدبیر بلندیوں سے پستیوں کی طرف کرتا ہے۔ (یعنی وہ بنا بخانۂ قانونِ خداوندی سے اتر کر اپنے طبعی نقطۂ آغاز کے مقام پر آجاتی ہے)۔ پھر وہ اسکیم (اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی) اس کی طرف بلند ہو جاتی ہے۔ ایسے طویل المیعاد عرصوں (یوم) میں جن کی مقدار تمہاری گنتی کے اعتبار سے ہزار ہزار سال ہوتی ہے۔ یہ ہے وہ خدا جو ہر شے کی موجودہ اور آنے والی حالت سے باخبر ہے۔ جو ہر شے کی نشوونما کیلئے اسے ایک (Pattern) عطا کرتا ہے۔ (رحیم) اور پھر اسے اپنے نظام کی قوت سے تکمیل تک پہنچاتا ہے۔

یعنی مشیت ایزدی کے سامنے ایک اسکیم ہوتی ہے جسے اس کی انتہائی پستی (نقطۂ اولیں، سب سے نچلی منزل) سے شروع کیا جاتا ہے پھر وہ اسکیم ان خاص قوانین کے ماتحت جو اس کے لئے متعین کئے جاتے ہیں، نشوونما ارتقار کے مراحل طے کرتی ہوئی، اس قالب (رحم یا Pattern) میں جو اس کی نمود اور پختگی کے لئے تجویز کیا جاتا ہے، اپنی تکمیل کے نقطۂ آخریں تک جا پہنچتی ہے۔ یہ مراحل بڑے بڑے بے "ایام" (Periods) میں طے ہوتے ہیں۔ کہیں ہزار ہزار سال کا ایک ایک تدریجی مرحلہ۔ کہیں پچاس پچاس ہزار سال کا۔ فی یوم کان مقدارہ خمسین الف سنۃ (۷۰/۴)۔ کارگہ مشیت کے ان عظیم المرتبت امور (Schemes) میں سے ایک اہم اسکیم انسان کی تخلیق بھی ہے۔ یہی اسکیم سردست ہماری زیر نظر بحث کا محور ہے۔

انسانی بچہ کی پیدائش آج ہمارے نزدیک ایک ایسا عادی اور معمولی واقعہ بن چکی ہے جیسے سورج کا طلوع و غروب۔ لیکن اسباب و علل کی کڑیوں میں جکڑا ہوا انسان جب اس کتابِ تخلیق کے اوراق کو پیچھے کی طرف الٹتا ہے تو اس کی نگہ استعجاب کا اس مقام پر جا کر رک جانا ضروری ہے جسے وہ اس سلسلۂ تخلیق انسانی کی سب سے پہلی کڑی قرار دیتا ہے۔ اس وادیٔ حیرت میں پہنچکر وہ ٹھٹک کر رہ جاتا ہے کہ "سب سے پہلا انسان" کس طرح وجود میں آگیا۔ اس کا تحیر بجا اور تعجب درست ہے۔ انسانی تحقیق و تفتیش کا

ماحصل، اس کے تمام انکشافات و ایجادات کی حقیقت، صرف اس قدر ہے کہ وہ کارگہ عالم کے مختلف پرزوں کے اسباب و علل کی کڑیوں پر پڑے ہوئے پردوں کو اپنی مژگانِ کاوش سے اٹھا لیتا ہے۔ لیکن جہاں اس سلسلۂ دراز کی آخری کڑی آجاتی ہے۔ اس کی نگہ تجسس کے سامنے پردۂ حیرت کے سوا اور کچھ نہیں رہتا۔ یہ مقامِ تحیر و استعجاب انسانی علم و تحقیق کی نسبت سے متعین ہوتا ہے۔ یعنی جسقدر علم و دانش کی منازل آگے بڑھتی جائیں گی اسی نسبت سے یہ مقام بھی آگے سرکتا جائے گا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچکر ایک خدا فراموش مادہ پرست اور ایک حق شناس عبد مومن کا فرق نمایاں طور پر سامنے آجاتا ہے۔ اول الذکر اس مقام سے آگے وادی حیرت کو اپنی ذہنی قیاس آرائیوں کی آماجگاہ بناتا ہے اور اس طرح خود بھی ٹھوکریں کھاتا ہے اور دوسروں کو بھی راہ سے گم کرتا ہے۔ لیکن ایک حکیم مومن وہاں پہنچکر بلا تامل پکار اٹھتا ہے کہ اس سلسلۂ دراز کی ابتدا اس قادر مطلق کی اسباب فراموش مشیت اور علل ناآشنا صمدیت کی رہین منت ہے جو انسانی سلاسل اسباب و ذرائع سے مستغنی اور علائق و علل سے بے نیاز ہے۔ وہ علیٰ وجہ البصیرت اس حقیقتِ عظمیٰ کا اعلان کرتا ہے اور اس طرح حیرت و استعجاب کی وہ وادی جو اس خدا فراموش محقق کی قیاس آرائیوں سے تیرہ و تار ہو چکی تھی، اس مردِ خود آگاہ و خدامست کی مشعلِ ایمان و شمع ایقان سے جگمگا اٹھتی ہے۔

سب سے پہلا انسان

سب سے پہلا انسان" کس طرح وجود پذیر ہو گیا؟ یہ وہ مقامِ تحیر ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ انسان نے جب آنکھ کھولی تو اپنے گرد و پیش ایک نگارخانۂ حیرت دیکھا۔ سطح ارض کی حدود فراموش وسعتیں فضائے آسمانی کی ناپیدا کنار پہنائیاں۔ سامنے ایک خوفناک بحرِ متلاطم، دائیں بائیں لرزہ انگیز دیوہیکل سلسلۂ کوہ۔ اوپر ایک معلق و مہیب چھت۔ افق کے اس پار سے، ہر صبح، ایک نگارۂ آتشیں کی نمود اور ہر شام شفق کی جوئے خونیں میں اس کا غروب۔ محفل انجم کی شمع فروزاں، کہکشاں کی گردِ مرمریں۔ چاند کا ساغرِ نور، وہ اس طلسم ہوش ربا کو دیکھتا تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتیں۔ وہ بھلا کیسے سمجھ سکتا کہ کائنات کا یہ محیر العقول سلسلہ کیا ہے؟ زمین کہاں سے آئی ہے۔ پہاڑ کیسے پیدا ہو گئے ہیں۔ سورج کہاں سے آتا اور کہاں چلا جاتا ہے؟ یہ چاند یہ تارے، یہ دریا، یہ سمندر کیسے پیدا ہو گئے؟ یہ سوالات بار بار اس کے سامنے آتے اور ہر بار اسے ایک نئی دنیائے حیرت میں چھوڑ جاتے۔ وہ بیچارا کیا سمجھ سکتا کہ

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟
ابر کیا چیز ہے؟ ہوا کیا ہے؟

اور جب وہ عالم آفاق کے متعلق کچھ نہ سمجھ سکتا تھا کہ ان کی تخلیق کس طرح سے ہو گئی تو بھلا اس معمہ کو کیسے سلجھا سکتا کہ "سب سے پہلا انسان" کس طرح پیدا ہو گیا؟ وہ زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا تھا کہ یہ کہہ کر اپنے دل کو تسلی دے لے کہ سب سے پہلے کسی نہ کسی طرح ایک مٹی کا پتلا بن گیا ہو گا جس میں جان ڈال دی گئی ہو گی۔ اور پھر اس پتلے کی پسلی چیر کر اس میں سے اس کے لئے ایک بیوی پیدا کر دی ہو گی اور یوں یہ سلسلہ آگے بڑھ گیا ہو گا۔ وہ بیچارا اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا تھا؟ لیکن جب انسان اور آگے بڑھ کر اپنے عہدِ شعور کو پہنچا تو اس کے زمانۂ طفولیت کی یہ توجیہ اس کے لئے باعثِ طمانیت اور وجہ شکیبائی نہ ہو سکتی تھی۔

اس کے اضطراب نے کاوشِ تجسس وخلشِ تحقیق کی صورت اختیار کی۔ اور اس علم الاشیاء کی مدد سے جو اس کی فطرت میں ودیعت کر کے رکھ دیا گیا تھا، اس نے ان پیچ در پیچ رموز کی گرہ کشائی کی کوشش شروع کی۔ اور رفتہ رفتہ اس کی تحقیقات نے اس نتیجہ کی صورت اختیار کر لی جسے آج نظریۂ ارتقاء سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس نظریہ کی تفاصیل بہت طویل ہیں لیکن ان سب کا ماحصل یہ ہے کہ

(۱) صفحۂ ارض پر زندگی (Life) کی ابتدا پانی سے ہوئی ہے۔

(۲) پانی اور مٹی کے امتزاج سے زندگی کے جرثومۂ اولیں کو پیکر عطا ہوا۔

(۳) زندگی کے یہ جراثیم مختلف نوعوں میں تقسیم ہو کر ایک درخت کی شاخوں کی طرح بڑھنے پھولنے لگے۔

(۴) ان جراثیم کے پیکروں میں ہزارہا ہزار سال کے مراحل کے بعد مختلف تبدیلیاں واقع ہوتی رہیں۔

(۵) ان طویل المیعاد مراحل کو طے کر کے سلسلۂ تخلیق اس منزل پر پہنچا جسے "تخلیق بذریعہ تناسل" کہتے ہیں یعنی حیوانی زندگی۔

(۶) حیوانی زندگی اسی قسم کے غیر محسوس، طویل المیعاد مراحل طے کرنے کے بعد منزل بمنزل انسانی پیکر میں جلوہ ریز ہوئی۔

اس طرح نوعِ انسانی کی ابتدا ہوئی۔

اب دیکھئے قرآن کریم اس سلسلہ میں کیا کہتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ تخلیقِ انسانی کی اسکیم کا آغاز درجۂ جمادات (طین۔ مٹی) سے ہوا۔

وبدا خلق الانسان من طین (۳۲/۷)

انسانی تخلیق کی ابتداء مٹی سے ہوئی۔

اس اجمال کی تفصیل قرآن کے دیگر مقامات میں موجود ہے لیکن میرے پیشِ نظر چونکہ استیعاب نہیں، اس لئے میں ان تفاصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ صرف اشارات پر اکتفا کرتا ہوں۔

اس منزلِ جمادات میں (جو اس سلسلہ کا نقطۂ آغاز ہے) زندگی محوِ خواب تھی (کنتم امواتا ۲/۲۸) اس کی بیداری پانی کے چھینٹے سے ہوئی۔

وجعلنا من الماء کل شیٍ حی ط افلا یؤمنون ۰ (۲۱/۳۰)

اور ہم نے ہر جاندار شے کو پانی (الماء) سے بنایا۔ کیا یہ لوگ پھر بھی ایمان نہیں لاتے

سرچشمۂ حیات

زندگی کی جل پری نے اپنی آنکھ پانی کی گہرائیوں میں کھولی۔ سائنس کی تحقیق اسی نقطہ پر پہنچی ہے کہ حیات کے جرثومۂ اولیں (Protoplasm) کی ابتدا سمندر میں ہوئی ہے۔ اسی لئے اس میں اسی نوعیت اور اسی تناسب کے املاح (Salt) پائے جاتے ہیں جیسے سمندر کے پانی میں۔ یوں تخلیقِ انسانی کا قافلہ وادیٔ خاک سے منزلِ آب کی طرف منتقل ہوا۔

وھو الذی خلق من الماء بشرا فجعلہ نسبا وصھرا، وکان ربک قدیرا۔ (۲۵/۵۴)

اور اللہ وہ ہے جس نے انسان کو پانی سے پیدا کیا۔ پھر اس کے رشتے اور ناتے بنائے اور تیرا رب (ہر بات پر) قادر ہے۔

پانی اور مٹی کے "خلاصہ" کے امتزاج سے، اس جرثومہ نے خلیہ (Cell)[1] کی شکل اختیار کی جس کے ہیولیٰ کو قرآن کریم نے طین لازب

---

[1] خلیہ (Cell) مرکب ہوتا ہے مادۂ مخیرہ (Nucleus) اور پیکر (Cell-body) سے۔

(کیچڑ کی سی چپچپی مٹی) سے تعبیر کیا ہے۔

انا خلقنٰھم من طین لازب ۰ (۱۱/۳۷)

ہم نے انسان کو طین لازب (چپچپی مٹی) سے تعبیر کیا ہے۔

طینِ لازب یہ طینِ لازب وہی ہے جو تالابوں کی تہہ میں اور جوہڑوں کے کنارے دکھائی دیتی ہے۔ جب پانی سوکھ جاتا ہے تو یہ سیاہ رنگ کی (کالی بُھجنگ) مٹی بڑی سخت ہو جاتی ہے۔

ولقد خلقنا الانسان من صلصال من حمإ مسنون ۰ (۲۶/۱۵) (نیز ۱۴/۵۵)

اور بلاشبہ یہ واقعہ ہے کہ ہم نے انسان کو خمیر اٹھے ہوئے گارے سے بنایا جو سوکھ کر بجنے لگتا ہے۔

پانی اور مٹی کی آمیزش سے جرثومۂ حیات نے پیکر کی شکل اختیار کی۔ ان خلیات (Cells) میں ایک لیس ارمادہ (Nucleus) زندگی کے تمام عظیم المرتبت امکانات اپنے اندر لئے ہوتا ہے، جیسے ایک ننھا سا بیج ایک تناور درخت کو اپنے اندر سمیٹے نمود شگفتگی کے لئے سراپا اضطراب ہو۔ حیات کا یہ نقطۂ آغاز نفس واحدہ ہے جس سے شجرِ زندگی کی شاخیں پھوٹتی ہیں۔ ایک خلیہ خاص مقدار تک پہنچکر جوش نمود سے خود بخود دو حصوں میں منقسم ہو جاتا ہے جنھیں (daughter cells) کہا جاتا ہے۔ اس

شجرِ ارتقاء نفسِ واحدہ سے جاندار مخلوق کی شاخیں پھوٹیں اور ایک طویل القامت درخت کی طرح سطح ارض پر پھیل گئیں۔ ہر شاخ کو مخلوق کی ایک الگ نوع (Species) سمجھئے۔ جو بڑھتی، پھولتی، پھلتی اپنی اپنی سمت میں نشوو ارتقا کے منازل طے کئے جا رہی ہے۔ ان تمام شاخوں میں سربلند نوعِ انسانی کی شاخ ہے جو اس نفسِ واحدہ کے ننھے سے بیج سے، مختلف مراحل طے کرتی، درجہ بدرجہ، قدم بقدم، جادہ بہ جادہ، منزل بمنزل اس بلندی تک آ پہنچی ہے۔

مالکم لاترجون للّٰہ وقارا ۰ وقد خلقکم اطوارا ۰ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ واللّٰہ انبتکم من الارض نباتا ۰ (۷۱/۱۳-۱۷)

تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ سے وقار کے آرزومند نہیں ہوتے۔ اور یقیناً اس نے تمہیں مختلف مراحل سے گزار کر پیدا کیا ہے۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور تمہیں زمین سے اگایا ہے۔ ایک طرح کا اگانا۔

اس خوردبینی نفسِ واحدہ سے سلسلۂ تخلیق آگے بڑھا۔ اس نشأۃِ اولیٰ کے بعد وہ نفسِ واحدہ مختلف منازل میں ٹھہرتا ہوا، اور آگے بڑھتا گیا۔ حتیٰ کہ وہ اس پیکرِ بشریت کے مقام تک آ پہنچا جو اس حیاتِ ارضی میں اس کی جائے قرار ہے۔

وھو الذی انشاکم من نفس واحدۃ فمستقر ومستودع ۰ قد فصلنا الآیات لقوم یفقھون ۰ (۹۹/۶)

وہی ہے جس نے تمہیں نفسِ واحدہ سے نشوونما دی۔ پھر تمہارے لئے قرار پانے کی جگہ (مستقر) اور سپردگی کا مقام (مستودع)[1]۔

بلاشبہ ہم نے اپنی آیات سمجھ بوجھ رکھنے والوں کے لئے تفصیل کے ساتھ بیان کر دی ہیں۔

---

[1] غور فرمایئے قرآن کریم نے جائے قرار کو صرف امانت گاہ (مستودع) کہہ کر کس طرح اس حقیقت کی طرف لطیف اشارہ کیا ہے کہ موجودہ پیکر بشری میں حیات بطور امانت رکھی گئی ہے۔

اس انتقالِ مکانی یعنی ایک مستقر سے دوسری منزل تک پہنچنے میں قریباً قرن (الف سنۃ) گزر گئے اور یوں جراثیمِ حیات (Life - cells) کے ابتدائی مرحلہ کے بعد وہ مقام آگیا جہاں تخلیق کا سلسلہ بذریعہ تناسل شروع ہوا۔

ثم جعل نسلہ من سللۃ من ماءٍ مھین ○ (۳۲/۸)

پھر اس کی (انسان کی) نسل کو حقیر پانی کے خلاصہ سے بنایا۔

حیوانی زندگی کی ابتداء

یعنی ان تمام سابقہ طبقات سے گزار کر ہزارہا سال کی تشکیل وتدبیر، ساخت و بافت کے بعد اس کا سلسلہ ایک حقیر پانی کے بچڑے سے جاری رکھا۔ یعنی حیوانی زندگی کا سلسلۂ افزائشِ نسل۔

ولقد خلقنا الانسان من سللۃ من طین ○ ثم جعلنٰہ نطفۃ فی قرارٍ مکین ○ (۲۳/۱۲-۱۳)

اور دیکھو! واقعہ یہ ہے کہ ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے پیدا کیا پھر ہم نے اسے نطفہ سے بنایا ایک ٹھہر جانے اور دباؤ پانے کی جگہ میں۔

قافلۂ حیات کی اس منزل میں جو مخلوق پیدا ہوئی اس میں رینگنے والے اور پاؤں کے بل چلنے والے حیوانات سب شامل ہیں۔

واللہ خلق کل دابۃ من ماءٍ فمنھم من یمشی علیٰ بطنہٖ ومنھم من یمشی علیٰ رجلین ○ ومنھم من یمشی علیٰ اربعٍ ○ (۲۴/۴۵)

اللہ نے ہر جاندار حیوان کو پانی سے پیدا کیا۔ ان میں سے وہ ہے جو اپنے پیٹ کے بل چلتا ہے۔ اور ان میں وہ بھی ہے جو دو پاؤں پر چلتا ہے۔ اور ان میں وہ بھی ہے جو چار پاؤں پر چلتا ہے۔

صرف رینگنے اور پاؤں کے بل چلنے والے ہی نہیں بلکہ پرندے بھی، یعنی وہ تمام مخلوق جس کا سلسلۂ افزائش بذریعہ تناسل آگے بڑھتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ زندگی کی اس بڑی شاخ سے بہت سی چھوٹی چھوٹی شاخیں اِدھر اُدھر پھوٹیں اس لئے اس حد تک یہ مختلف اقسام کی مخلوق، دراصل ایک ہی نوع کی مختلف شکلیں اور ایک ہی قافلہ کے مختلف افراد ہیں۔

وما من دابۃ فی الارض ولا طٰئرٍ یطیر بجناحیہ الا امم امثالکم ○ ما فرطنا فی الکتٰب من شیءٍ ثم الیٰ ربھم یحشرون ○ (۶/۳۸)

اور زمین میں چلنے والا کوئی حیوان اور ہوا میں پروں سے اڑنے والا کوئی پرندہ ایسا نہیں جو تمہاری ہی طرح گروہ (امت) نہ ہو اور ہم نے نوشتہ (الکتٰب) میں کوئی بھی بات فروگزاشت نہیں کی۔ پھر (سب) اپنے رب کے حضور جمع کئے جائیں گے۔

نر و مادہ کا امتیاز

یہ وہ مقام ہے جہاں ذکورو اناث (نر اور مادہ) کا امتیاز محسوس طور پر ہمارے سامنے آتا ہے۔

واللہ خلقکم من ترابٍ ثم من نطفۃٍ ثم جعلکم ازواجاً ○ (۳۵/۱۱)

اور اللہ نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا پھر نطفہ سے۔ پھر تمہیں جوڑے بنا دیا۔

یعنی اس مقام پر خلیات حیات (Life-cells) میں جنسی تخلیق (Sexual reproduction) کا جوہر نمایاں ہوگیا۔ یہ جرثومے (Germ cells or Gametes) دو حصوں میں تقسیم ہو گئے ایک (Ovum) یعنی مادہ کا خلیہ اور دوسرا (Spermatazoon) نر کا خلیہ۔ یعنی ایک جرثومہ زندگی، ذوقِ تخلیق سے نر اور مادہ کے خلیوں میں بٹ گیا۔

هو الذی خلقکم من نفس واحدة و جعل منها زوجها ...... (۷/۱۸۹)

اللہ وہ ہے جس نے تمہیں نفسِ واحد (جرثومۂ حیات) سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا۔

دوسری جگہ ہے:۔

ومن کل شئ خلقنا زوجین لعلکم تذکرون (۵۱/۴۹)

اور ہم نے ہر شے کے جوڑے بنائے (اور ان امور کا ذکر اس لئے کیا کہ تم) اس بھولی ہوئی حقیقتوں کی یاد تازہ کرسکو۔

اس نفسِ واحدہ نے پیکرِ حیوانی میں بھی قریباً قرن گزارے۔ ان ادوار میں "انسان" ابھی قابلِ ذکر شے نہ تھا۔

هل اتی علی الانسان حین من الدهر لم یکن شیئاً مذکوراً (۷۶/۱)

کیا انسان پر وہ زمانہ نہیں گزر چکا جب یہ قابلِ ذکر شے نہ تھا۔

پیکرِ انسانی حیوانی زندگی کی ان تمام شاخوں میں سے ایک شاخ اوپر کو ابھری۔ یہ پیکرِ انسانی کی شاخ تھی۔ پیکرِ حیوانی کو بتدریج سنوارا گیا۔ اسے حشو و زوائد سے پاک کرکے اسکے لطیف و نازک جوہروں میں جلا دی گئی۔ اور یوں عروسِ حیات حریمِ بشریت میں جلوہ ریز ہوئی۔

الذی خلقك فسوّٰك فعدلك۔ (۸۲/۷)

وہ ذات جس نے تجھے پیدا کیا پھر (ہر طرح سے) درست کیا پھر (اعضاء و جوارح میں) تناسب پیدا کیا۔

پھر اسے احسن تقویم عطا فرمائی:۔

لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم ٥ (۹۵/۴)

اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے انسان کو بہترین ہیئت میں پیدا کیا۔

یہ احسن تقویم کیا ہے؟ اس بہترین ہیئت میں کون سی امتیازی خصوصیت ہے؟ وہ کونسا جوہرِ خصوصی ہے جس کی بنا پر انسان سلسلۂ ارتقاء کی سابقہ کڑیوں سے الگ تھلگ حیثیت کا مالک بن گیا؟ قرآن کریم نے اسے ایک لفظ میں بیان فرمایا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ وہی لفظ اس کی امتیازی خصوصیت کو ایک نمایاں جامعیت سے ادا کرسکتا ہے۔ فرمایا۔ ثم سواه و نفخ فیه من روحه (۳۲/۹) (پھر اسے درست کیا اور اس میں اپنی روح پھونکی) یعنی شجرِ ارتقاء کی اس شاخ بلند و بالا کو ہر طرح سے

درست کیا۔ اس میں مناسب صلاحیت و استعداد پیدا کی۔ اسے سنوارا اور آگے بڑھایا اور جب اس میں یہ صلاحیتیں پیدا ہو گئیں تو اُسے درجۂ حیوانیت سے آگے بڑھا کر اس میں خدائی قوت کا کرشمہ ڈالا۔ اب وہ دیکھنے سننے اور سمجھنے سوچنے والا انسان بن گیا۔

شرفِ انسانیت

وجعل لکم السمع والابصار والافئدۃ قلیلا ما تشکرون۔ (۳۲/۷۸) (اور اس نے تمہارے لئے سمع، بصر اور قلب بنایا۔ لیکن تھوڑے ہیں جو شکر گزار ہیں) یہ "روح خداوندی" کیا ہے جس کی کرشمہ سازیوں نے ایک پیکرِ آب و گل کو کائنات کا جانِ مدعا بنا دیا؟ اس کی تفصیل کا یہ مقام نہیں۔۔۔۔ اس وقت صرف اتنا دیکھئے کہ اس "نفخ روح" سے حاصل کیا ہوا؟ قرآن کریم کے الفاظ میں اس سے سمع و بصر و قلب عطا ہوا۔ کہنے کو تو یہ تین لفظ ہیں لیکن اگر غور سے دیکھئے تو شرف و مجد انسانیت کی پوری کی پوری دنیا ان تین گوشوں میں سمٹ آئی ہے۔ دنیا میں یہی ذرائع علم ہیں اور علم ہی وہ امتیاز خصوصی ہے جس نے انسانی زندگی کو حیوانی زندگی سے نمایاں طور پر الگ کر دیا ہے۔ اس سمع و بصر سے انسان کن ذمہ داریوں کا حامل بن جاتا ہے۔ یہ پھر قرآن ہی کی ایک آیۂ مقدسہ میں دیکھئے۔ فرمایا:

انا خلقنا الانسان من نطفۃ امشاج نبتلیہ فجعلنہ سمیعا بصیرا۔ انا ھدینہ السبیل اما شاکرا واما کفورا۔ (۷۶/۲)

یقیناً ہم نے انسان کو نطفہ سے پیدا کیا جو باہمی ملجانے والا ہوتا ہے (پھر اسے) ہم مختلف حالتوں میں متغیر و متبدل کرتے رہے (حتیٰ کہ) اسے سننے اور دیکھنے والا بنا دیا۔ اسے (پھر) ہدایت کا راستہ دکھا دیا۔ خواہ یہ اسے قبول کرلے یا اس سے انکار کر دے۔

اختیار و ارادہ کا جوہر

یہ ہے وہ سب سے بڑا امتیاز جو انسان کو حیوانی زندگی سے الگ کرتا ہے۔ یعنی شعور و تعقل اور اس کی بنا پر اختیار و ارادہ۔ اس مقام پر پہنچ کر سلسلہ ارتقا کی یہ کڑی اپنی سابقہ کڑیوں سے ممتاز ہو جاتی ہے۔ انسانی پیکر اپنے سلسلہ کے گذشتہ طبقات کی استعداد اور صلاحیتوں کا حاصل جمع (Sum-total) نہیں۔ بلکہ یہاں پہنچ کر ان تمام صلاحیتوں اور جوہروں میں ایک اور ہی قسم کی تبدیلی پیدا ہوئی جو ارتقا کے اس سلسلہ سے بالکل مختلف تھی جو اس وقت تک چلا آ رہا تھا۔ اس تبدیلی کا نتیجہ انسانی اختیار و ارادہ ہے جس سے نبض کائنات میں تموج اور زندگی کی جوئے رواں میں تلاطم برپا ہے۔ اختیار و ارادہ کے بغیر یہ دنیا پہاڑوں، دریاؤں، جنگلوں کا بے رنگ مجموعہ اور درندوں، چرندوں، پرندوں کا بے کیف مسکن (Zoo) رہتی۔ حسن کی ضیائے تابندہ اور عشق کی آتش سوزندہ اس کے نصیب میں نہ ہوتی۔ یہ سب "نفخ روح" کی کرشمہ کاریاں ہیں جن سے یہ ویرانہ رنگ و تعطر کا کاشانہ بن گیا۔ یہی وہ "نفخ روح" تھی جس سے یہ آدم خاکی مسجود ملائکہ قرار پایا۔

اذ قال ربک للملئکۃ انی خالق بشرا من طین۔ فاذا سویتہ ونفخت فیہ من روحی فقعوا لہ ساجدین (۳۸/۷۱-۷۲)

جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں مٹی سے انسان بنانے والا ہوں پس جب اسے (مختلف مراحل ارتقا کے بعد) سنوار دوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم اس کے آگے سجدے میں گر جانا۔

یہ ہے قرآن کریم کی رو سے جواب اس سوال کا کہ "سب سے پہلا انسان" کس طرح وجود میں آگیا؟ کہئے کہ علم و عقل، دانش و بینش، سائنس اور علوم و فنون متعلقہ، اس سے کچھ زیادہ یا الگ بھی پیش کر سکے ہیں؟ اور یہ تبیان حقیقت ہوا کس زمانہ میں؟ اس وقت جب دنیا ہنوز سائنس اور اس کے لزومات و ماجریات سے آشنا تک نہ تھی۔ آگے بڑھنے سے پیشتر ایک مرتبہ پھر نگہِ بازگشت ڈالئے اس آیہ مقدسہ پر جس سے اس موضوع کی ابتدا ہوئی ہے۔ نگہ ڈالئے اور غور کیجئے کہ یہ پوری کی پوری داستانِ طول و طویل کس حسن و اعجاز نگاری سے چند جملوں میں سمیٹ کر رکھدی گئی ہے۔ ارشاد ہے:

یدبر الامر من السماء الی الارض ثم یعرج الیہ فی یوم کان مقدارہ الف سنۃ مما تعدون ۰ . . . .

. . . . الذی احسن کل شئ خلقہ وبدا خلق الانسان من طین ۰ ثم جعل نسلہ من سللۃ من ماء مھین ۰ ثم سوٰیہ ونفخ فیہ من روحہ وجعل لکم السمع والابصار والافئدۃ ۰ قلیلا ما تشکرون ۰ (۳۲/۵-۹)

اللہ اپنے امر (اسکیم) کی تدبیر آسمان سے زمین کی طرف کرتا ہے۔ پھر وہ اسکیم (اپنے ارتقائی مراحل طے کر کے) اس کی طرف بلند ہو جاتی ہے۔ ایک (ایک) دن (منزل) میں جس کی مقدار تمہاری گنتی کے لحاظ سے ہزار (ہزار) سال کی ہوتی ہے . . . . . . (مثلاً) وہ ذات جس نے اپنی مخلوق میں ٹھیک ٹھیک تناسب پیدا کیا۔ اور انسان کی پیدائش کی ابتدا مٹی سے کی۔ پھر اس کی نسل کو حقیر پانی کے خلاصہ سے بنایا۔ پھر اسے درست کیا اور اس میں اپنی روح پھونکی۔ اور اس نے تمہارے لئے سماعت و بصارت اور قلب بنایا لیکن بہت تھوڑے (انسان) ایسے ہیں جن کی مساعی ثمر بار ہوتی ہیں۔

اس سلسلۂ ارتقاء سے نوعِ انسانی (نہ کہ کوئی خاص فرد) وجود پذیر ہوئی۔

لیکن قرآن کریم تخلیقِ کائنات اور تشکیلِ انسانی (سلسلۂ ارتقاء) کے ان اصولوں کو اس لئے بیان نہیں کرتا کہ اسے طبیعیات کے طالب علموں کے لئے نصاب کی کتاب بننا تھا۔ ان توجیہات و تفصیلات سے اس کا مقصود کچھ اور ہے۔ وہ سب کچھ بیان کرنے کے بعد انسانوں سے کہتا ہے کہ ذرا غور کرو کہ کائنات میں محو و تثبیت اور فنا و بقا کا کونسا اصول کام کر رہا ہے اور کس جبروت و اقتدار سے کام کر رہا ہے؟ یہ ایسا البطشِ شدید و اخذ وبیل کا قانون ہے جس کی گرفت سے کوئی باہر نہیں جا سکتا۔

اعمالِ صالحہ سے مراد

وہ قانونِ ارتقاء کے اس بنیادی اصول کو مختلف گوشوں اور متنوع پہلوؤں سے دلنشین کراتا ہے کہ اس کارگہِ سعی و عمل میں وہی نوع باقی رہ سکتی ہے جس میں باقی رہنے کی صلاحیت ہو (جس کے اعمال صالح ہوں)، وہی آگے بڑھ سکتی ہے جو اپنے اندر آگے بڑھنے کی استعداد پیدا کرے۔ وہ دیگر انواع کی مثال دیکر اس سے خود انسانی زندگی پر استشہاد کرتا ہے کہ ارتقاء کے اس عظیم الشان درخت کو دیکھو اور غور کرو کہ کتنی شاخیں تھیں جو سوکھ سوکھ کر گر گئیں، کتنے پھول تھے جو مرجھا مرجھا کر زمین پر آ لئے اور راستہ چلنے والوں کے پاؤں تلے آ کر مسلے گئے۔ اس کے برعکس

کتنی شاخیں ہیں جو سرسبز و شاداب ہوئیں۔ کیسے کیسے شگفتہ اور نورستہ پھول لائیں اور کیسے کیسے نفیس و لطیف پھل پیدا کئے۔ وہ کہتا ہے کہ فطرت کے اس قانون پر غور کرو اور سوچو کہ اقوام و ملل گزشتہ کا کیا حشر ہوا؟ اس کا ارشاد ہے کہ مختلف انواع کی طرح قوموں کی موت و حیات کا بھی یہی قانون ہے، جو قوم زندگی کی اہل نہیں رہتی فنا ہو جاتی ہے۔ اسے کوئی رعایت نہیں دی جاتی۔ اس فیصلہ (یعنی ان کے اعمال کے ظہور نتائج) میں ذرہ بھر تقدیم و تاخیر نہیں ہو سکتی۔

ولکل امۃ اجل ۚ فاذا جاء اجلھم لا یستاخرون ساعۃ ولا یستقدمون ۝ (۷/۳۴)

اور ہر امت (گروہ۔ جماعت۔ نوع) کیلئے (ظہور نتائج) کا وقت معین ہے جب وہ وقت آجاتا ہے تو پھر ایک ساعت کی بھی تقدیم و تاخیر نہیں ہو سکتی۔

اس اصولی نکتہ کو بیان کر دینے کے بعد اگلی آیت میں یہ بتا دیا کہ زندہ اور باقی رہنے کے لئے کیا قانون مقرر ہے۔ فرمایا:

یٰبنی اٰدم اما یاتینکم رسل منکم یقصون علیکم اٰیتی ۙ فمن اتقی واصلح فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون ۝ (۷/۳۵)

اے اولاد آدم۔ جب کبھی ایسا ہو کہ میرے پیغمبر تم میں پیدا ہوں اور میرے قوانین سے تمہیں مطلع کریں۔ سو (اسوقت) جو ان قوانین سے ہم آہنگی پیدا کرے گا اور (یوں اپنے اندر زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کی) صلاحیت پیدا کرے گا تو اس پر (مٹنے اور زوال پذیر ہو جانے کا) کوئی غم اور اندیشہ نہ ہوگا۔

یہ تو ہیں وہ جو باقی رہیں گے۔ آگے بڑھیں گے جنہیں ہلاکت و بربادی کا اندیشہ نہ ہوگا۔ برعکس ان کے

والذین کذبوا بایتنا واستکبروا عنھا اولٰئک اصحاب النار ھم فیھا خلدون ۝ (۷/۳۶)

لیکن جو لوگ ان قوانین کو جھٹلائیں گے اور ان سے سرکشی برتیں گے تو وہ لوگ اہل جہنم ہوں گے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

قوموں کے عروج و زوال کے اصول

غور فرمائیے۔ پہلی آیت میں قوموں کی موت و حیات کا ایک اصولی قانون بیان فرما دیا۔ اس کے بعد اس کی وضاحت کر دی کہ ہلاکت سے مامون اور بربادی سے مصئون و بے خوف رہنے کا کیا طریقہ ہے۔ اور وہ کون سا نظام ہے جس پر چل کر انسان امن و سلامتی کی جنت میں پہنچ سکتا ہے۔ اس وقت اس نظام کی تشریح کا موقع نہیں۔ یہاں صرف اتنا دیکھئے کہ قرآن کریم کی رو سے اس نظام کا اصل الاصول یہ ہے کہ اس ضابطہ کو نصب العین حیات بنایا جائے جو حضرات انبیاء علیہم السلام کی وساطت سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانوں کو ملا ہے۔ وہ نظام جس کے مطابق زندگی بسر کرنے کا فطری نتیجہ یہ ہوگا کہ اس قوم میں وہ صلاحیت پیدا ہو جائے گی جس سے وہ فنا و برباد کر دینے والی مخالف قوتوں کا مردانہ وار مقابلہ کر سکے۔ اور اُسے کسی قسم کا خوفِ ہلاکت و حزنِ بربادی نہ رہے (لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون) اگر وہ ایسا نہ کرے گی تو خدا کا قانونِ استخلاف و استبدال (Law of succession and substitution) اپنا اٹل فیصلہ کر دے گا اور اس قوم کی جگہ دوسری قوم آجائے گی۔

وربک الغنی ذو الرحمۃ ۔ ان یشاء یذھبکم ویستخلف من بعدکم ما یشاء کما انشاکم من

ذریۃ قوم اٰخرین ۰ (۶/۱۳۴) (نیز ۱۴/۱۹ ، ۳۵/۱۶)

اور (دیکھو) تیرا پروردگار بے نیاز ہے (اس لئے وہ اپنے قوانین کے نفاذ میں کسی کا محتاج نہیں اور کسی سے دبتا نہیں) اور رحمت والا ہے۔ اگر وہ چاہے (تو اپنے قوانین مشیت کے ماتحت) تمہیں ہٹا دے اور تمہارے بعد اس قانون مشیت کے مطابق جس قوم کو چاہے تمہارا جانشین بنا دے جس طرح اس نے ایک دوسری قوم کی ذریت سے تمہیں اٹھا کھڑا کیا ہے۔

دوسری جگہ ہے:

وان تتولوا یستبدل قوما غیرکم ۰ ثم لا یکونوا امثالکم ۰ (۴۷/۳۸) (نیز ۵/۵۴ ، ۴/۱۳۳)

اور اگر تم نے (ان قوانین سے) سرکشی اختیار کی تو وہ تمہاری جگہ دوسری قوم کو لے آئے گا۔ اور وہ قوم تمہارے جیسی نہیں ہوگی (بلکہ تم سے بہتر ہوگی۔ اسی لئے تو وہ تمہاری جگہ لے گی)۔

مغنیِ آتش نفس، موسیقار کی طرح ایک قوم کی راکھ کے ڈھیر سے دوسری قوم وجود کوش ہوتی ہے۔ مٹنے والی قومیں مٹ جاتی ہیں اور باقی رہنے والی ان کی جگہ لے لیتی ہیں۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں:

چوں جہاں کہنہ شود پاک بسوزند ورا

وز ہماں آب و گل ایجادِ جہاں نیز کنند

جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے، اس نقطہ کی تشریح کا یہ موقعہ نہیں کہ وہ نظام جس سے قوموں کو ثبت و استحکام حاصل ہوتا ہے اس کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں۔ لیکن اس ضمن میں ایک اصولی گوشہ ایسا ہے جس کی طرف اشارہ کئے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ مغرب کے نظریۂ ارتقا کی رو سے بقاء (Survival) کے لئے اصلح (Fittest) ہونا ضروری ہے لیکن قرآن کی رو سے، قانونِ بقا و استحکام کے لئے اصلح کے ساتھ ساتھ انفع ہونا بھی ضروری ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بقا اس کا حصہ نہیں جو اپنی ذات میں باقی رہنے کی صلاحیت رکھتا ہے بلکہ یہ سعادت اس کی "قسمت" میں آتی ہے جو اپنی ذات میں محکم و خود گیر ہونے کے بعد نوعِ انسانی کیلئے سب سے زیادہ نفع رساں ہو۔ وہ واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ

واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض (۱۳/۱۷)

یاد رکھو! کرۂ ارض میں قیام و بقا اس کیلئے ہے جو نوعِ انسانی کیلئے سب سے زیادہ نفع پہنچانے والا ہے۔

بقاء للاصلح . . . (Survival of the Fittest) کے نظریے نے اقوامِ یورپ کو یہ سبق دیا کہ جو قوم سب سے زیادہ قوت سمیٹ لیگی اور رزق کے سرچشموں کو اپنے لئے وقف کر لے گی، خواہ اس سے باقی اقوام کے جسم میں خون کا قطرہ تک بھی باقی نہ رہے، زندگی اور اس کی شادابیاں اس کے حصہ میں آئیں گی۔ انھوں نے اس قانون پر عمل کیا اور اس میں شبہ نہیں کہ اس سے ان اقوام پر غلبہ و تسلط حاصل کر لیا جو قوتِ تخلیق سے عاری ہو چکی تھیں اور جن میں زندگی کی کوئی صلاحیت باقی نہیں رہی تھی۔ لیکن چونکہ بقاء للاصلح کے قانون سے بقائے دوام حاصل نہیں ہو سکتا تھا (اس سے حیاتِ خلد کا وہ فریب حاصل ہو سکتا تھا

جسے ابلیس نے آدم کے لئے وجۂ فسونِ نظر بنایا تھا) اس لئے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد دنیا نے دیکھ لیا کہ ان اقوام کی اصلحیت (Fitness) کس قدر بے بنیاد ثابت ہوئی۔ قرآن کی رُو سے زندگی کا قانون بقاء للانفع ہے۔ یعنی جو نظام نوعِ انسان کیلئے سب سے زیادہ نفع بخش ہو اسی کو باقی رہنے کا حق حاصل ہے۔ دنیا مغرب کے قانونِ بقاء للاصلح کا تجربہ کر چکی ہے اور اب اس نظام کی تلاش اور انتظار میں ہے جو خود اپنی ذات ہی میں اصلح نہ ہو بلکہ نوعِ انسان کے لئے انفع بھی ہو۔ قرآن کا مقصود دنیا میں اسی نظام کی ترویج و تنفیذ تھا جسے میں اپنی تحریروں میں نظامِ ربوبیت سے تعبیر کرتا چلا آرہا ہوں۔ انسانیت کا مستقبل اسی قوم کے ہاتھوں میں ہو گا جو اس نظام کی داعی اور حامل ہو گی۔

قانونِ ارتقاء کی رُو سے وہی نوع آگے بڑھ سکتی ہے جس کی مضمر صلاحیتیں اس قدر نشوونما حاصل کر لیں کہ وہ تخریبی قوتوں کی مدافعت کر سکنے کی اہل ہو جائیں۔ نظامِ ارتقاء میں یہ وہ بنیادی اصول ہے جس سے کسی کو رعایت نہیں مل سکتی۔ انسانی معاشرہ میں یہ استعداد صرف نظامِ ربوبیت سے حاصل ہو سکتی ہے جس میں افرادِ معاشرہ کے مضمر جوہر کی اس قدر آبیاری ہو جاتی ہے کہ وہ یاس و قنوط (ابلیسیت) کی تمام تخریبی قوتوں پر غلبہ پا کر زندگی کی بشارتوں سے بہرہ یاب ہو جاتے ہیں۔ خاک کے ذرے اپنے تدریجی مراحل طے کر کے پیکرِ انسانی میں جلوہ بار ہو گئے۔ اس منزل تک قانونِ ارتقاء طبعی قوانین کے تابع چلتا تھا۔ ڈاروِن اور اس کے متبعین کی یہ غلط فہمی تھی کہ انھوں نے عالمِ انسانی کو بھی اس لاٹھی سے ہانکنا چاہا حالانکہ کاروانِ حیات کو وادیٔ انسانیت میں پہنچ کر جداگانہ قوانین کی مشعلِ ہدایت دی گئی تھی۔ ایک حیوان کی زندگی یکسر انفرادی ہے اور وہ انفرادی طور پر اپنے طبعی تقاضوں (کھانے پینے) کی تسکین سے زندہ رہ سکتا ہے۔ یہی اس کی زندگی کا مقصود ہے۔ لیکن انسان کی زندگی انفرادی زندگی نہیں بلکہ معاشرتی زندگی ہے اور اس کے تقاضے، حیوانی زندگی کے انفرادی تقاضوں سے مختلف ہیں۔ یہ وہ عظیم القدر اہم لطیف اور بنیادی فرق ہے جسے قرآن نے کفر و ایمان اور جنت و جہنم کے فرق سے تعبیر کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ان اللہ یدخل الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات جنٰت تجری من تحتھا الانھار۔ یقیناً اللہ ان لوگوں کو جنھوں نے اس کے عطا فرمودہ نظام و قوانین کو نصب العین حیات بنالیا اور جن کی روش میں ابھاری صلاحیتیں پیدا کرنے والے کام کئے: ایسے معاشرہ میں داخل کرے

۴۴ ایسے باغات کی سی ہے جس کے نیچے نہریں جاری ہوں تاکہ آکی شادابیوں اور سرسبزیوں میں کبھی کمی نہ آسکے اور اس کا ہر لودہ ثمر بار ہو۔ ان کے برعکس۔ والذین کفروا یتمتعون و یاکلون کما تاکل الانعام والنار مثوی لھم ۔ جو لوگ اس نظام سے انکار کرتے ہیں وہ اس قسم کا انفرادی نظام قائم کرتے ہیں جس میں سامانِ زیست سے تمتع اور اکل و شرب، بالکل اس انداز سے ہوتا ہے جس طرح حیوانی زندگی کا تقاضا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا معاشرہ جہنمی ہے کہ جس میں انسانی نشوونما کی تمام صلاحیتیں جھلس کر رہ جاتی ہیں۔ اس سے اگلی آیت میں ہے:۔

وکاین من قریۃ ھی اشد قوۃ من قریتک التی اخرجتک اھلکنھم فلا ناصر لھم

اور کتنی ایسی بستیاں تھیں جو قوت میں ان لوگوں سے بڑھ کر تھیں جنھوں نے (اے رسول) تجھے باہر نکال دیا ہے۔

ہم نے انھیں ہلاک کرایا۔ سو کوئی ایسا نہ ہوا جو ان کی شادابی کا سامان پیدا کر دیتا۔

اس لئے کہ ان تمام قوموں نے اپنے معاشرہ کو حیوانی قانونِ ارتقاء کے قانون پر قائم رکھا تھا جس میں بقا کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ لہٰذا قانونِ خداوندی کے مطابق ان کی ہلاکت یقینی تھی۔ اس لئے کہ

افمن کان علی بینۃ من ربہ کمن زین لہ سوء عملہ واتبعوا اھواء ھم (۴۷/۱۴)

جو قوم اپنے نشوونما دینے والے کے واضح قوانین کی حامل ہو، ان جیسی کبھی نہیں ہو سکتی جن کے اعمال معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کریں اور وہ ایسے مقاصد کے پیچھے چلیں جو پستی کی طرف لے جانے والے ہوں۔ لیکن یہ اعمال و مقاصد انھیں دکھائی دیں بڑے خوش آئند (کیونکہ وہ سمجھ رہے ہوں کہ یہ اعمال ان کی بقا اور استحکام کے کفیل ہیں۔)

انسانی زندگی میں عروج و زوال، ترقی و تنزل، صعود و ہبوط، آگے بڑھنے اور رک جانے اور رفتہ رفتہ فنا ہو جانے کا یہی اٹل قانون ہے۔ اسی قانون کے مطابق امتوں کی موت و حیات کے فیصلے ہوتے رہے ہیں اور آج بھی ہو رہے ہیں۔ جس قوم نے ایسا نظام قائم کر لیا جو نوعِ انسانی کیلئے انفع ہو (یعنی ان کی ربوبیت کا کفیل) وہ ارتقائے حیات میں ایک منزل آگے بڑھ گئی۔ اسی منزل کا نام جنت ہے جس کی ابتدا اسی دنیا سے ہو جاتی ہے لیکن جس کا خاتمہ موت کے ساتھ نہیں ہوتا کہ

زندگی جوئے رواں است و رواں خواہد بود

یہ نظام صرف قرآن کے متعین کردہ خطوط پر متشکل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کی کوئی اور صورت نہیں۔ لیکن جو قوم نہ صرف اپنی ذات کے لئے اصلح ثابت ہوئی نہ نوعِ انسانی کے لئے انفع، اس کی نشوونما کی تمام صلاحیتیں جھلس کر رہ گئیں۔ اولٰئک اصحٰب النار ھم فیھا خالدون۔

تاریخِ رسالت ۔ (معارف القرآن۔ جلد سوم)

انبیائے کرامؑ کیا پیغام لاتے رہے اور اسے اپنے اپنے دور میں کیسے نافذ العمل کرتے رہے ان کی داستان ــــ قرآنی نقطۂ نظر سے ــــ تاریخ رسالت میں ملاحظہ کیجئے ــــ

۳۱ ردسمبر تک رعایتی قیمت صرف دس روپے۔ علاوہ محصولڈاک۔

معراجِ انسانیت (معارف القرآن۔ جلد چہارم)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ انقلاب و تنفیذ

نظام اسلامی کی داستان ــ سیرت مقدسہ قرآن کے آئینہ میں

۳۱ ردسمبر تک رعایتی قیمت صرف بارہ روپے۔ علاوہ محصولڈاک۔

ادارہ طلوع اسلام۔ رابسن روڈ۔ کراچی

سلیم کے نام

پرویز

سلیم! تم پوچھتے ہو کہ یہ ہوا کیا؟ جو کچھ "اقیموا الصلوٰۃ" کا ترجمہ "نماز پڑھو" کر دینے سے صلوٰۃ کا حشر ہوا وہی کچھ "صلوۃ علی النبی" کا ترجمہ "رسول پر درود بھیجو" کر دینے سے ہو گیا۔ نہ نماز عربی کا لفظ ہے نہ درود۔ دونوں عجمی ہیں اور بعد کی پیداوار۔ وہی اقامتِ صلوٰۃ جس سے کبھی زمین و آسمان وجد میں آجاتے تھے، نماز کے تصور سے پوجا پاٹ کی رسم بن کر رہ گئی۔ اسی طرح وہی صلوٰۃ علی النبی، جو ایک انقلاب عظیم کا عملی پروگرام تھا، درود میں تبدیل ہو کر تسبیح کے دانوں پر چند الفاظ دہرانے اور اس طرح مصلے کے نیچے سے پانچ روپے روزانہ حاصل کرنے یا عذابِ جہنم سے نجات پانے کا ذریعہ بن گیا۔ اور یہ عقیدہ عام ہو گیا کہ ـــــ ہر مرض کی دوا درود شریف۔ مختلف قسم کے درود تصنیف ہوئے اور ہر درود کے وظیفے کے مختلف طریق بیان کئے گئے۔ کچھ اعلانیہ کچھ خفیہ۔ کچھ کتابوں میں کچھ سینہ بسینہ، علم لدنی کے ذریعے۔ اب کیفیت یہ ہو چکی ہے کہ درود شریف اور اس کی برکات ایک ایسا مسلمہ بن چکا ہے جس کے متعلق کچھ سوچنے اور غور کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ حتیٰ کہ سمجھا یہ جاتا ہے کہ اگر کسی کے دل میں اس قسم کا کوئی خیال بھی پیدا ہو تو اس کے ایمان میں خلل ہے۔ اُسے ان "شیطانی وساوس" سے فوراً توبہ کرنی چاہیے۔

"صلوٰۃ علی النبی" کے قرآنی حکم کا حقیقی مفہوم کیا ہے۔ اس تک پہنچنے سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں اس کی حقیقت کیا ہے؟ سورۂ احزاب میں ہے۔

ان اللہ وملئکتہ یصلون علی النبی۔ یایھا الذین اٰمنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما (۳۳/۵۶)

اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے۔

بیشک اللہ اور اس کے فرشتے درود بھیجتے ہیں رسول پر۔ اے ایمان والو تم بھی اس پر درود بھیجو اور سلام بھیجو اچھا سلام۔

اس آیت میں (مروجہ مفہوم کے مطابق) خدا یہ کہتا ہے کہ (i) ہم اور ہمارے فرشتے رسول پر درود بھیجتے ہیں۔ اور (ii) اے مسلمانو، تم بھی رسول پر درود بھیجو۔ یعنی دوسرے حصے میں خدا، مسلمانوں کو حکم دیتا ہے کہ تم بھی یہی کچھ کرو۔

اب غور کرو سلیم! کہ مسلمان اس حکمِ خداوندی کی تعمیل کس طرح کرتے ہیں؟ وہ یہ درود پڑھتے ہیں:

اللھم صل علیٰ محمد ..... (پورا درود بعد میں لکھا جائے گا)

اس کے معنی ہیں۔ اے اللہ تو محمدؐ پر درود بھیج۔

تم نے سوچا سلیم! کہ یہ بات کیا ہے؟

اللہ کہتا ہے کہ ہم اور ہمارے فرشتے رسول پر درود بھیجتے ہیں۔ مسلمانو! تم بھی رسول پر درود بھیجو!

اور مسلمان اس کے جواب میں کہتے ہیں۔ اے اللہ تو محمدؐ پر درود بھیج۔ خدا کہتا ہے کہ میں تو پہلے درود بھیج رہا ہوں۔ تم بھی درود بھیجو۔ اور مسلمان اسے پھر لوٹا کر کہتے ہیں کہ اے خدا! تو رسول پر درود بھیج!! اور ایک مرتبہ نہیں کہتے۔ دس دس ہزار مرتبہ۔ لاکھ لاکھ مرتبہ کہتے چلے جاتے ہیں کہ اے اللہ! تو رسول پر درود بھیج۔ یعنی خدا ان سے کہتا ہے کہ رسول پر درود بھیجو۔ اور یہ خدا سے کہتے ہیں کہ تو ہی درود بھیج۔ حالانکہ اس نے پہلے ہی کہدیا ہے کہ میں ایسا کر رہا ہوں۔

غور کرو سلیم! ہم اس فقرہ کو (اللھم صل علیٰ محمد) اپنی نمازوں میں پڑھتے ہیں۔ زندگی میں لاکھوں مرتبہ دہراتے ہیں۔ روئے زمین پر تمام مسلمان ہر روز کروڑوں مرتبہ یہ الفاظ پکارتے ہیں لیکن کیا ہم نے کبھی سوچا بھی ہے کہ بالآخر ہم کہتے کیا ہیں؟

جب دین، مذہب میں تبدیل ہو جائے تو اس کا ایسا ہی حشر ہوا کرتا ہے، سلیم! مذہب کا فرمان یہ ہوتا ہے کہ تاثیر محض الفاظ کے دہرانے میں ہوتی ہے۔ ان کے مطلب اور مفہوم سے کچھ غرض نہیں ہوتی۔ جو شخص الفاظ کے مطلب کی طرف توجہ دلاتا ہے وہ الحاد اور زندیقیت کی طرف دعوت دیتا ہے۔ اس کی مت سنو کیونکہ اس سے تمہارے ایمان میں خلل آجانے کا اندیشہ ہے۔ جو کچھ بزرگوں سے ہوتا چلا آرہا ہے، آنکھیں بند کر کے کئے چلے جاؤ۔ بس اسی میں تمہاری نجات ہے۔ شریعت میں عقل کو کوئی دخل نہیں۔ عقل کام ابلیس کا ہے۔

یہاں سے سلیم! تمہارے دل میں یہ خیال پیدا ہوگا کہ جب قرآن میں صرف اتنا ہے کہ یا ایھا الذین اٰمنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما۔ تو پھر یہ فقرہ (اللھم صل علیٰ محمد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔) کہاں سے آگیا؟ یہ فقرہ وہیں سے آگیا جہاں سے تمہارا باقی مروجہ مذہب آیا ہے۔ بخاری میں ہے کہ حضورؐ سے دریافت کیا گیا کہ ہم آپ پر کس طرح درود بھیجیں تو آپ نے فرمایا کہ اس طرح کہو۔ اللھم صل علیٰ محمد وعلیٰ اٰل محمد کما صلیت علیٰ ابراھیم وعلیٰ اٰل ابراھیم انک حمید مجید۔ اللھم بارک علیٰ محمد وعلیٰ اٰل محمد کما بارکت علیٰ ابراھیم وعلیٰ اٰل ابراھیم انک حمید مجید۔ دوسری جگہ ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اس طرح کہو کہ اللھم صل علیٰ محمد وازواجہ وذریتہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (اے اللہ درود بھیج محمدؐ پر اور آپ کی ازواج اور اولاد پر)۔ اس کے بعد کتب روایات میں درود شریف کی فضیلت کے متعلق بہت کچھ آیا ہے۔ نسائی میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جو شخص مجھ پر ایک مرتبہ درود بھیجے گا اللہ اس پر دس مرتبہ رحمت نازل کریگا۔ اس کے دس گناہ معاف کر دے گا اور اس کے دس درجے بلند کرے گا۔ ترمذی میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ قیامت کے دن لوگوں میں سب سے زیادہ میرے قریب رہ شخص ہوگا جو مجھ پر اکثر درود پڑھنے والا ہے۔ ابوداؤد میں ہے کہ جس دعا کے ساتھ درود پڑھا جائے گا وہ مستجاب ہوگی۔ اگر اس کے ساتھ درود نہ پڑھا جائے تو وہ زمین اور آسمان میں معلق رہتی ہے۔ (یہ آخری حصہ ترمذی میں ہے)۔

اب اس درود شریف پر غور کرو سلیم! جو بخاری کی روایت کے مطابق نبی اکرمؐ نے امت کو تعلیم فرمایا۔ اللھم صل علیٰ محمد وعلیٰ آلِ محمد۔ . . . قرآن میں صرف رسول اللہؐ پر "درود بھیجنے" کا حکم تھا لیکن اس درود میں محمدؐ کے ساتھ آلِ محمدؐ بھی شامل کر دی گئی ہے اور یہی درود ہے جسے ہم اپنی نمازوں میں دہراتے ہیں۔ "آلِ محمدؐ" کا اضافہ صاف صاف بتا رہا ہے کہ یہ درود کہاں وضع ہوا تھا اور کس طرح سنیوں کی کتب روایات میں شامل کر دیا گیا۔ اس اضافہ کی رو سے ہر سید پر درود بھیجنا واجب ہو گیا، اسلئے کہ وہ آلِ محمدؐ میں شامل ہے اور آلِ محمدؐ پر درود بھیجنا، بخاری کی حدیث کے مطابق فرمانِ نبویؐ ہے اور جو شخص ارشادِ نبویؐ کی اطاعت نہ کرے اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ یہ وہ خالص نسل پرستی ہے جسے مٹانے کے لئے رسول اللہؐ مبعوث ہوئے تھے۔ شیعہ حضرات کے ہاں تو آلِ محمدؐ کی محبت جزوِ ایمان ہے۔ ان کے مذاہب کا مدار ہی آلِ محمدؐ کی عقیدت پر ہے۔ لیکن غور کیجئے کہ یہ عقیدہ خود سنیوں کے ہاں بھی کس طرح جزوِ دین بن گیا۔ ان کی نماز نہیں ہو سکتی جب تک رسول اللہؐ کے ساتھ دنیا کے ہر سید پر درود نہ بھیجا جائے۔ سُنّی حضرات کے سامنے جب یہ سوال آتا ہے تو وہ تاویلات و تفسیرات سے اس الجھاؤ سے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ آلِ محمدؐ سے مراد حضورؐ کی اولاد نہیں بلکہ امتِ محمدیہؐ ہے۔ لیکن اول تو آلِ محمدؐ کی تشریح ذریتہ کا لفظ کر رہا ہے جو دوسری روایت میں موجود ہے۔ پھر یہ روایت بھی انہی کے ہاں موجود ہے جس میں حضرت امام حسنؓ نے فرمایا کہ انا آل محمد لا تحل لنا الصدقۃ "ہم آلِ محمدؐ ہیں۔ ہمارے لئے صدقہ جائز نہیں"۔ اس سے آلِ محمدؐ کا مفہوم واضح ہے۔ علاوہ بریں ان کی کتب روایات میں آلِ محمدؐ (اہل بیت اور عترتِ رسول اللہؐ) کی فضیلت میں اس قدر احادیث موجود ہیں کہ ان کی روشنی میں اس مفہوم کے سمجھنے میں کچھ دقت ہی نہیں رہتی۔ ایک روایت میں تو یہانتک ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ "میں نے تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑی ہیں اگر تم انھیں مضبوط پکڑے رہے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے۔ ایک چیز خدا کی کتاب ہے اور دوسری چیز میری عترت (اولاد) ہے"۔ (ترمذی)۔ دوسری روایت میں ہے کہ "خدا کی کتاب اور میری عترت قیامت کے دن تک ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے یہانتک کہ وہ حوض پر آئیں۔ پس تم دیکھو کہ میرے بعد تم ان دونوں سے کیا سلوک کرتے ہو"۔ اسی طرح مسلم کی روایت (غدیر) مشہور ہے جس میں آپ نے فرمایا کہ "میں تم میں دو بھاری چیزیں چھوڑ چلا ہوں۔ ایک کتاب اللہ اور دوسرے میرے اہل بیت۔ میں تم کو خدا سے ڈراتا اور خدا کو یاد دلاتا ہوں کہ تم میرے اہل بیت کو نہ بھولنا۔ ہاں میں پھر یاد دلاتا ہوں کہ میرے اہل بیت کے حق کو نہ بھولنا"۔ ایک اور روایت میں ہے کہ میرے اہل بیت کشتی نوحؑ کی طرح ہیں جو اس میں سوار ہو گیا، نجات پا گیا جو ان کے ساتھ نہ رہا تباہ ہو گیا۔ وغیرہ وغیرہ

یہ سب کچھ سلیم! سنیوں کی کتب روایات میں ہے شیعہ حضرات کی نہیں۔ ان کی روشنی میں آلِ محمدؐ پر درود بھیجنے کا لزوم و وجوب آسانی سے سمجھ میں آ سکتا ہے۔ علاوہ بریں اسی درود میں جو گلا اٹکا ہے (کما صلیت علیٰ ابراھیم وعلیٰ آل ابراھیم۔ جیسا درود بھیجا تو نے ابراہیمؑ اور آلِ ابراہیمؑ پر)۔ اس سے بھی آل کے معنی کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ آلِ ابراہیمؑ سے مراد حضرت ابراہیمؑ کی اولاد تھی جسے اللہ نے حکومت و نبوت سے سرفراز فرمایا تھا۔ اس لئے آلِ محمدؐ سے بھی مراد اولاد رسول اللہؐ ہی ہو سکتی ہے۔

ضمناً ایک اور چیز بھی قابل غور ہے۔ اس ٹکڑے کو پھر دیکھو۔ کما صلیت علیٰ ابراھیم وعلیٰ آل ابراھیم۔ یعنی جیسا اللہ نے ابراہیم اور آل ابراہیم پر درود بھیجا۔ قرآن میں اس کا کہیں ذکر نہیں آیا کہ اللہ نے حضرت ابراہیمؑ یا آلِ ابراہیمؑ پر درود بھیجا۔ اسلئے معلوم نہیں کہ کما صلیت کہاں سے لیا گیا ہے؟

علاوہ بریں، ایک اور بات بھی قابل غور ہے۔ اللہ نے کہا ہے کہ ان اللہ وملئکتہ یصلون علی النبی۔ یعنی اللہ اور اس کے فرشتے "صلوۃ علی النبیؐ" کرتے ہیں۔ اس کے بعد ہے یا ایھا الذین اٰمنوا صلوا علیہ۔ اے ایمان والو تم بھی صلوٰۃ علی النبی کرو۔ یعنی جو حکم ہے یہ ہے کہ جو کچھ اللہ اور اس کے فرشتے اس باب میں کرتے ہیں وہی کچھ تم بھی کرو۔ ہم اس حکم کی تعمیل اس طرح کرتے ہیں کہ اللھم صل علیٰ محمدؐ وعلیٰ آل محمدؐ کے الفاظ دہراتے رہتے ہیں۔ اب دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو اللہ اور اس کے فرشتے بھی یہی الفاظ دہراتے رہتے ہیں۔ اور یا وہ کچھ اور کرتے ہیں۔ اگر وہ بھی یہی الفاظ دہراتے رہتے ہیں تو اس سے زیادہ مضحکہ انگیز صورت اور کیا ہو گی کہ ہم سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ بیٹھے ہوئے یہ کہتے رہتے ہیں کہ "یا اللہ محمدؐ اور آل محمدؐ پر درود بھیج" اور اگر اللہ تعالیٰ یہ نہیں کرتا کچھ اور کرتا ہے تو جو کچھ ہم کرتے ہیں وہ ارشاد خداوندی کی تعمیل نہیں۔ کیونکہ خدا تو کہتا ہے کہ جو کچھ ہم کرتے ہیں تم بھی وہی کچھ کرو۔

بہرحال سلیم! اتنی بات تو تمہاری سمجھ میں آ گئی ہو گی کہ درود بھیجنے کا یہ طریق جو کتب روایات میں مذکور ہے رسول اللہؐ نے ارشاد نہیں فرمایا ہو گا یہ کہیں اور سے آیا ہے۔ لیکن اس کی داد دینی پڑے گی کہ امتِ مسلمہ کو کس طرح غیر شعوری طور پر دین کی صراطِ مستقیم سے ہٹا کر لفظی گورکھ دھندوں میں الجھا دیا گیا اور کس طرح نسل پرستی ان کا جزو دین بنا کر ان کے اعماق قلب میں داخل کر دی گئی (واشربوا فی قلوبھم العجل) کہ اب اس کے نکلنے کے ساتھ ہی جان نکلنے کا بھی اندیشہ لاحق ہو جاتا ہے۔ ساحرینِ دربار فرعون نے اگر نگاہ بندی (اعین الناس) سے رسیوں کو سانپ بنا کر دکھا دیا تھا، تو وہ تو یونہی وقتی فریب نگاہ تھا۔ سحر کاری تو یہ ہے کہ تیرہ سو سال سے پوری کی پوری امت کی آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے اور کسی کو احساس تک بھی نہیں ہونے پاتا کہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے! قربان جائیے اس نظامِ عجم کے جو موت کو ایسا دلہن بنا کر لایا ہے کہ آج تک اس کے طلسم آفریں چہرے سے نقاب ہی نہیں اٹھ سکا۔

میں یہ لکھ رہا ہوں، سلیم! اور تمہارے دل کی دھڑکنیں میری انگلیوں کو محسوس ہو رہی ہیں جو اس بیتابی کی غماز ہیں جو یہ معلوم کرنے کے لئے تمہارے آبگینۂ قلب سے چھلک کر باہر آ رہی ہے کہ درود کا قرآنی مفہوم کیا ہے؟ ذرا تھمو۔ اتنی بے صبری کیوں؟ یا تو یہ عالم کہ ساری عمر ہر نماز میں اللھم صل علیٰ محمدؐ وعلیٰ آل محمدؐ۔ پڑھتے چلے آئے اور کبھی ایک ثانیہ کے لئے بھی یہ سوچنے کے لئے نہ رُکے کہ ان الفاظ کا مفہوم کیا ہے۔ اور یا اب یہ کیفیت کہ ـــــ سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا ـــــ اچھا سنو!

یہ تو تم نے ہزار مرتبہ سنا ہو گا کہ قرآن کریم میں ہے کہ ان اللہ وملئکتہ یصلون علی النبی یا ایھا الذین امنوا صلوا

علیہ وسلموا تسلیما۔ لیکن یہ شاید تم نے آجتک کسی واعظ سے نہ سنا ہوگا کہ اسی قرآن میں، اسی سورۂ احزاب میں، اسی رکوع میں یہ بھی ہے کہ ھوالذی یصلی علیکم وملئکتہ۔ (اللہ وہ ہے جو خود اور اس کے فرشتے تمام مومنین پر درود بھیجتے ہیں) یعنی اس امر میں نبی اکرمؐ کے ساتھ اختصاص نہیں بلکہ یہ ایک ایسی چیز ہے جس میں پوری کی پوری جماعتِ مومنین بھی شامل ہے۔ یعنی جہاں اللہ اور اس کے فرشتے، رسول اللہ پر درود بھیجتے ہیں، وہاں وہ تمام مومنین پر بھی درود بھیجتے ہیں۔ یہاں تک میں نے صل علیٰ کا ترجمہ "درود بھیجنا" کیا ہے۔ یعنی مروجہ ترجمہ۔ اب تم "درود بھیجنے" کا تصور ذہن سے الگ کردو اور اس طرح خالی الذہن ہو کر سمجھو کہ قرآن کی ان آیات کا صحیح مفہوم کیا ہے اور صل علیٰ کے حکم کی تعمیل کس طرح ہو سکتی ہے؟ ذرا توجہ اور تحمل سے کام لینا سلیم! کیونکہ جو بات آگے آتی ہے وہ صدیوں کے متوارث عقیدے اور عام تصور کے خلاف جائے گی اس لئے اسے پوری طرح سمجھنے اور دل میں جگہ دینے کے لئے خاص توجہ کی ضرورت ہوگی۔

پوری آیت یوں ہے:-

ھوالذی یصلی علیکم وملئکتہ لیخرجکم من الظلمٰت الی النور وکان بالمؤمنین رحیما (۳۳/۴۳)

یعنی اللہ اور اس کے ملائکہ جماعتِ مومنین کے ساتھ صلوٰۃ کا تعلق رکھتے ہیں۔

تاکہ

وہ جماعت مومنین کو ظلمات (تاریکیوں) سے نکال کر نور (روشنی) کی طرف لے جائیے۔

اللہ اور اس کے فرشتوں کی صلوٰۃ سے مفہوم کیا ہے، سر دست اسے تو چھوڑ دو۔ اس آیت سے یہ تو واضح ہو گیا کہ اس صلوٰۃ خداوندی کا مقصد یہ ہے کہ جماعتِ مومنین ظلمات سے نکل کر نور میں آجائے۔ یہ ہے وہ مقصد جس کے حصول کے لئے اللہ اور اس کے فرشتے کچھ کرتے ہیں (جسے اس نے صلوٰۃ علی المؤمنین سے تعبیر کیا ہے)۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ ظلمات سے نکل کر نور میں آجانے سے کیا مفہوم ہے؟ قرآن کریم میں یہ اصطلاح (اخراج من الظلمات الی النور) کئی مقامات پر آئی ہے۔ ان میں سورۂ ابراہیم کی یہ آیت مقصد زیر نظر کے لئے بہت واضح ہے جہاں فرمایا کہ

ولقد ارسلنا موسیٰ بایٰتنا ان اخرج قومک من الظلمٰت الی النور۔ وذکرھم بایام اللہ۔

ان فی ذالک لاٰیٰت لکل صبار شکور۔ (۱۴/۵)

ہم نے موسیٰ کو اپنا قانون دیکر اس مقصد کیلئے (مصر میں واپس) بھیجا کہ وہ اپنی قوم کو ظلمات سے نور کی طرف نکال کر لے آئے اور انہیں "ایام اللہ" کی یاد دلائے۔ یقیناً اس واقعہ میں ہر اس قوم کے لئے جو مصافِ زندگی میں ثابت قدم رہے اور اپنے سینے کو عزم و آرزو سے بھرپور رکھے، فتح و کامرانی کی نشانیاں ہیں۔

قوم موسیٰ (بنی اسرائیل) مصر میں فرعونی نظام کے شکنجوں میں جکڑی ہوئی تھی۔ استبداد ملوکیت کی تمام قہرمانیاں اور خوئے غلامی کی رذالت کے سامانیاں ان پر ہر طرف سے مسلط تھیں۔ یہی وہ حالت جسے قرآن نے ظلمات (تاریکیوں) سے تعبیر کیا ہے۔

اس سے بڑھ کر کسی قوم کی تیرہ بختی اور کیا ہوگی؟ یہ تھی بنی اسرائیل کی پہلی حالت جہاں سے نکالنے کے لئے صاحبِ ضرب کلیم، حضرت موسیٰؑ کو متعین کیا گیا۔ اس کے بعد ان کی دوسری حالت وہ تھی جس کے متعلق فرمایا کہ ہم نے انھیں حریت و آزادی اور حکومت و ثروت کی نعمتوں سے سرفراز کر دیا اور ایسا ماحول بہم پہنچا دیا جہاں ان پر ان کے خدا کے سوا اور کسی کا قانون مسلط نہ تھا۔ یہ تھی وہ حالت جسے نور سے تعبیر کیا گیا ہے۔

حضرت موسیٰؑ کو صرف قوم بنی اسرائیل کی طرف بھیجا گیا تھا کہ وہ انھیں ظلمات (انسانی محکومیت کی پستی اور ذلت) سے نور (نظامِ خداوندی کے تابع زندگی بسر کرنے کی سرفرازیوں) کی طرف لے آئیں۔ لیکن نبی اکرمؐ کو اس مقصد کے لئے بھیجا گیا کہ حضورؐ تمام نوعِ انسانی کو ظلمات سے نور کی طرف لے آئیں یعنی انسانیت، غلط نظامہائے حیات کے جن اطواق و سلاسل میں جکڑی ہوئی تھی اور بالادست انسانوں کے جور و استبداد کے جس بوجھ کے نیچے دبی ہوئی تھی، اسے ان سے نجات دلا کر اللہ کے نظامِ حریت ربوبیت کے اندر لے آئیں (لیضع عنھم اصرھم والاغلل التی کانت علیھم) اس انقلابِ عظیم (یعنی نوعِ انسانی کو ظلمات سے نور کی طرف لانے) کے لئے، اللہ تعالیٰ نے نبی اکرمؐ کو کیا عطا فرمایا، اس کی تصریح قرآن کریم نے متعدد مقامات میں کر دی ہے۔ خود اسی سورۂ ابراہیم کے شروع میں ہے (جس کی ایک آیت قوم بنی اسرائیل کے ضمن میں اوپر نقل کی گئی ہے) کہ

الرا۔ کتاب انزلنہ الیک لتخرج الناس من الظلمات الی النور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (۱۴/۱)

یہ وہ ضابطۂ قانون ہے جو تجھے اس لئے دیا گیا ہے کہ تمام نوعِ انسانی کو ظلمات سے نور کی طرف لے آئے۔

سورۂ مائدہ میں ہے کہ قد جاءکم من اللہ نور وکتاب مبین (اللہ کی طرف سے تمہاری طرف روشنی آگئی ہے۔ یعنی ایک ایسا ضابطۂ آئین جو بالکل واضح ہے) یھدی بہ اللہ من اتبع رضوانہ سبل السلام۔ (اللہ اس کے ذریعے، ہر اس قوم کو جو اس کے قانون کی اتباع کریگی سلامتی کے راستے کی طرف راہ نمائی کرے گا) ویخرجھم من الظلمات الی النور (اور اس طرح انھیں ظلمات سے نکال کر نور کی طرف لے جائے گا)۔ یہی سورۂ حدید میں آیا ہے (دیکھو ۵۷/۹)۔ سورۂ بقرہ میں اس کی مزید وضاحت کر دی کہ نور سے مراد نظامِ خداوندی ہے اور ظلمات سے مفہوم ہر غیر خداوندی (طاغوتی) نظام۔ فرمایا،

فمن یکفر بالطاغوت ویومن باللہ فقد استمسک بالعروۃ الوثقی لا انفصام لھا۔ واللہ سمیع علیم (۲/۲۵۶)

جس نے ہر غیر خداوندی نظام سے انکار کر دیا اور اللہ کے متعین فرمودہ نظام کو اپنا نصب العین حیات بنایا۔ تو اس نے ایک ایسے آسرے کو تھام لیا جو کبھی نہیں ٹوٹے گا۔

اس کے بعد ہے۔

اللہ ولی الذین اٰمنوا یخرجھم من الظلمات الی النور

اس جماعتِ مومنین کو اللہ کی سرپرستی اور حمایت حاصل ہے جو انھیں ظلمات سے نور کی طرف لے جائیگی۔

اس کے برعکس

الذین کفروا اولیٰئھم الطاغوت یخرجونھم من النور الی الظلمات ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (۲/۲۵۷)

جو لوگ اس نظام سے انکار کرتے ہیں، انھیں غیر خداوندی نظاموں کی تائید و سرپرستی حاصل ہوتی ہے لیکن وہ انھیں نور سے ظلمات کی طرف لے جاتے ہیں۔

سلیم! ان آیاتِ جلیلہ میں "اللہ ولی الذین اٰمنوا" کے ٹکڑے کو ذرا اچھی طرح ذہن نشین کر لینا کیونکہ اسی سے "ھوالذی یصلی علیکم" اور "ان اللہ وملئکتہ یصلون علی النبی" کا مفہوم سمجھ میں آئیگا۔ ان تصریحات سے واضح ہے کہ

(i) رسول اللہ اس لئے مبعوث ہوئے تھے کہ تمام نوع انسانی کو غیر خداوندی نظاہائے حیات (ظلمات) سے نکال کر نظامِ خداوندی (نور) کی طرف لے آئیں۔

(ii) یہ انقلابِ عظیم قرآن کریم کی راہ نمائی میں ظہور پذیر ہوتا تھا کیونکہ نظام خداوندی اسی نظام کا نام ہے جو قرآنی اصولوں کے مطابق تشکل ہو۔

(iii) چونکہ اس نظام کی تشکیل و تنفیذ میں ہر غیر خداوندی نظامِ استبداد کی شکست مضمر تھی اس لئے وہ چاہتے تھے کہ قرآنی نظام کامیاب نہ ہونے پائے۔ لہٰذا تمام طاغوتی قوتیں، اس انقلابِ قرآنی کی مخالفت کے لئے متحد تھیں۔

(iv) دوسری طرف، اس انقلاب برپا کرنے والی قوم (محمد رسول اللہ والذین معہ) کو قانونِ خداوندی کی تائید و نصرت حاصل تھی یہ تھی وہ کشمکش جسے قرآن نے "اخراج من الظلمٰت الی النور" کی جامع اصطلاح سے تعبیر فرمایا ہے۔ اس کے لئے نبی اکرمؐ سے کہدیا گیا کہ یہ نظام قرآن کی روشنی میں تشکل ہوگا لیکن اس کے لئے، آپ کے ساتھ جماعتِ مومنین کا ہونا بھی ناگزیر ہے۔ اسی لئے فرمایا کہ

یا یھا النبی حسبک اللہ ومن اتبعک من المؤمنین (۸/۶۴)

اے نبی! تیرے لئے اللہ (کے قانون کی تائید) اور جماعتِ مومنین جو تیری اتباع کرے۔ کافی ہے۔

انقلاب خداوندی کے انہی اجزائے ترکیبی کو دوسرے مقام پر ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

(i) اولی الالباب الذین اٰمنوا۔ وہ عقل و خرد کے مالک جو ایمان لائے۔

(ii) رسولاً یتلوا علیکم اٰیات اللہ وہ رسول جس نے خدا کا قانون پہنچایا۔

(iii) الذین اٰمنوا وعملوا الصالحٰت ایمان کے ساتھ اعمالِ صالح

اس انقلاب کے ذریعے ظلمات سے نور کی طرف منتقل ہوا جائے گا۔ (۶۵/۱۱-۱۰)

یعنی قرآن۔ بہ حیثیت مرکزِ آئین نظام

رسول۔ بہ حیثیت امامِ نظام

جماعت۔ نظام کی قوتِ نافذہ۔

ان کے ساتھ ولایتِ خداوندی، یعنی خدا کی تائید و نصرت شامل ہوتی ہے تاکہ یہ نظام قائم اور نافذ ہو سکے۔

ان تصریحات کے بعد سلیم! سورۂ احزاب کی متعلقہ آیت کو پھر سامنے لاؤ اور اسے سورۂ ابراہیم کی اس آیت کی روشنی میں دیکھو جس میں حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا ہے کہ وہ بنی اسرائیل کو ظلمات سے نور کی طرف نکال کر لے آئیں۔ سورۂ احزاب کی آیات یہ ہیں۔

یاایھا الذین اٰمنوا اذکروا اللہ ذکرًا کثیرًا (۳۳/۴۱)

اے ایمان والو! اللہ کا ذکر کرو۔ بہت زیادہ ذکر۔

"اللہ کا ذکر" کیا ہے؟ یہ ایک جداگانہ موضوع ہے اور اس خط میں اس کے متعلق تصریحاً کچھ نہیں لکھا جا سکتا۔ اس کے متعلق کبھی پھر دریافت کرنا۔ اس وقت صرف اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ جب حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا کہ "ہم نے تمہیں اپنی ذات کیلئے چن لیا ہے"۔ تم سے ایک بہت بڑا کام لیا جائے گا۔ اور وہ کام یہ ہے کہ فرعون کی طرف جاؤ۔ اس کا استبداد حدود فراموش ہو رہا ہے۔ تو اسوقت حضرت موسیٰؑ سے تاکید کی گئی کہ

اذھب انت واخوك بایٰتی ولا تنیا فی ذکری (۲۰/۴۲)

تم اور تمہارا بھائی میرے قانون کے حامل بنکر جاؤ۔ (کام بہت بڑا ہے) دیکھنا۔ میرے ذکر میں کوتاہی نہ کرنا۔

اس سے ظاہر ہے کہ "خدا کے ذکر" سے مفہوم کیا ہے۔ اس سے مفہوم ہے، سلیم! غیر خدائی نظامہائے زندگی کو تہ و بالا کرنے میں قانونِ خداوندی کو ہر وقت پیشِ نظر رکھنا۔ لہٰذا یاایھا الذین اٰمنوا اذکروا اللہ ذکرًا کثیرًا (۳۳/۴۱) میں بھی اللہ کے ذکر سے یہی مراد ہے۔ نہ کہ مراقبے میں بیٹھ کر قلب پر الا اللہ کی ضربیں لگانا۔ اس سے اگلی آیت ہے وسبحوہ بکرۃ واصیلا (۳۳/۴۲)۔ اس کے معنی عام طور پر کئے جاتے ہیں کہ صبح اور شام خدا کی تسبیح کرو۔ اور تسبیح سے مراد لی جاتی ہے سبحان اللہ کا ورد کرنا۔ تسبیح کے معنی تم معارف القرآن (جلد اول) میں دیکھ چکے ہو۔ اس کے معنی ہوتے ہیں فرائض مفوضہ کی سرانجام دہی میں انتہائی تگ و تاز کرنا۔ لہٰذا ان دونوں آیتوں کا مطلب یہ ہوا کہ

اے وہ جماعت مومنین جو دنیا میں نظام خداوندی کے قیام کو اپنا نصب العین بنا چکے ہو، غیر خداوندی نظاموں کے انہدام میں قانونِ خداوندی کو ہر وقت سامنے رکھو اور اس مقصد کے حصول میں صبح شام انتہائی تگ و تاز کے ساتھ مصروفِ عمل رہو۔

اس کے بعد ہے:-

ھوالذی یصلی علیکم وملئکتہ لیخرجکم من الظلمت الی النور۔ (۳۳/۴۳)

جب تم یہ کچھ کرو گے جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ تو اللہ کے قانون اور تدبیر امور کرنے والی قوتوں کی تائید تمہیں حاصل ہو گی۔ اس طرح تمہیں مقصد پیشِ نظر میں کامیابی ہو جائے گی اور تم ظلمات سے نور کی طرف آ جاؤ گے۔

صلوا کا لفظ بڑا جامع اور کثیر المعانی ہے (مجھے افسوس ہے، سلیم! کہ میں نظامِ صلوٰۃ پر ابھی تک کچھ نہ لکھ سکا۔ یہ تمام باتیں اس میں، اپنے اپنے مقام پر آجاتیں۔ لیکن تمہیں تو معلوم ہے کہ پچھلے دنوں مجھے کس قدر مصروفیتیں اور پریشانیاں رہیں) صلّی علی کے معنی ہوتے ہیں کسی کی بہتری چاہنا۔ تحسین و تبریک (Commendation)، عروج و سربلندی (Exaltation) ترفعِ مقام و احوال (Magnification)۔ لہٰذا ھوالذی یصلی علیکم کے معنی یہ ہوئے کہ اگر تم زندگی کے ہر قدم میں قانونِ خداوندی کو پیشِ نظر رکھو گے (ذکر اللہ) اور اپنے نصب العین (قیامِ نظامِ خداوندی) کے حصول میں عمل پیہم اور سعی مسلسل سے کام لوگے (سجدہ) تو اللہ کی تائید و نصرت تمہارے شاملِ حال ہوگی۔ اس کے قانون کے اٹل نتائج تمہاری سربلندی و سرفرازی کا موجب بنیں گے۔ تمہیں دنیا میں شوکت و رفعت نصیب ہوگی اور اس طرح قیامِ نظامِ خداوندی سے تم انسانوں کی غلامی کی تاریکیوں سے نکل کر نورِ خداوندی کی وادیٔ ایمن میں آجاؤ گے جہاں تم پر لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون کی سکوں پاش بارشیں ہوں گی۔

اللہ اور اس کے ملائکہ کی تائید و نصرت سے مراد کیا ہے اور وہ کس طرح حاصل ہوتی ہے؟ یہ بھی ایک الگ موضوع ہے جسے ضمناً اس خط میں نہیں چھیڑا جا سکتا۔ لیکن چونکہ میں جانتا ہوں کہ اگر میں نے اس ضمن میں کچھ نہ لکھا تو تمہارے اگلے خط میں ہی اس کے متعلق استفسار آجائے گا اس لئے، کنایۃً چند الفاظ اس کے متعلق بھی لکھے دیتا ہوں۔ تم تو ایک بہت بڑے طبیب کے پوتے ہو۔ تم نے دیکھا تھا کہ تمہارے دادا ابا (مرحوم) نسخہ تو لکھوا دیا کرتے تھے ایک منٹ میں لیکن اس کے بعد اس کے اوزان میں کتنا وقت صرف کیا کرتے تھے! یہی ان کی حذاقت کا راز تھا۔ میں نے اچھے اچھے طبیبوں سے سُنا کہ حکیم جی کی دقتِ نظر اور فنی قابلیت کا اندازہ لگانا ہو تو ان کے نسخے کے اوزان بدل کر دیکھو۔ کبھی خاطر خواہ نتیجہ مرتب نہ ہوگا۔ نسخے میں دوائیاں وہی ہوں گی لیکن ان کا توازن بدل دینے سے نتیجہ کچھ سے کچھ ہو جائے گا۔ اوزان ہی نہیں بلکہ اس کے طریق استعمال اور مختلف دوائیوں کے تقدم و تاخر سے بھی نتائج کچھ سے کچھ ہو جاتے تھے۔ اسے بھی چھوڑو۔ تم جانتے ہو! بارود کی شعلہ فگن اور کوہ پاش قوت کا راز کیا ہوتا ہے؟ اس کے اجزائے ترکیبی کا صحیح توازن اور ترکیب۔ ایک صحیح مرکب کی قوت اس کے اجزاء کی مجموعی قوت سے نہ صرف کہیں زیادہ بلکہ بعض اوقات ان سے کہیں مختلف ہوتی ہے۔ مشین کی قوت کا راز اس کے پرزوں کے باہمی ربط و نظم میں ہے۔ یہ قوت ان پرزوں کی انفرادی قوت سے کہیں زیادہ اور الگ ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ حقیقت تمہارے سامنے آگئی کہ اصل شے مختلف اسباب و علل (یا انفرادی اجزاء) کا جمع کر لینا نہیں۔ ان اجزا میں ایک خاص نظم و ضبط پیدا کرنا ہے۔ صحیح نتیجہ اس نظم و ضبط کا نام ہے۔

اشیائے طبیعیات کی طرح، یہی اصول انسانی امور و معاملات میں بھی کارفرما ہے۔ اگر کوئی کام قاعدے اور قانون کے مطابق کیا جائے۔ اس میں مختلف عناصر کا توازن و تناسب بالکل ٹھیک ہو۔ شروع سے آخر تک ہر قدم صحیح نظام کے ماتحت اٹھے تو اس کا نتیجہ ایسا تحیر انگیز ہوگا جس کا اندازہ ہی نہیں لگایا جا سکتا۔ انسانی امور کے نتیجہ خیز ہونے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک نظام (ضابطہ قوانین) عطا فرمایا ہے۔ اگر انسانی کوششیں اس قاعدے اور نظام کے خلاف ہوں گی تو ان کا کچھ نتیجہ نہیں نکلیگا۔ (اولئک حبطت اعمالھم) یا وہ نتیجہ بہت کمزور اور عارضی ہوگا۔ لیکن اگر وہی کوششیں اس نظام کے تحت ظہور میں

آئیں گی، تو ان کا نتیجہ ایسا درخشندہ و تابندہ ہوگا جس سے آسمان کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو جائے گی۔ اس کا نام تائید و نصرتِ خداوندی ہوتا ہے۔ یعنی وہ قوت (تائید) جو اس نظم و ربط سے پیدا ہوئی جو اللہ کے متعین فرمودہ نظام و آئین کے تحت عمل میں آیا تھا۔ (ملائکہ کے متعلق تم معارف القرآن کی دوسری جلد میں تفصیل سے دیکھ چکے ہو)۔ اسی تائید کا نام "صلوات من اللہ" ہے۔ یہ تائید کن حالات میں حاصل ہوتی ہے اور اس کا مستحق کن لوگوں کو قرار دیا جاتا ہے، اس کے متعلق سورۂ بقرہ کی ۱۵۵-۱۵۶ آیات کو دیکھئے جن میں بتایا گیا ہے کہ یہ ان لوگوں کا حصہ ہے جن پر تبدیلیٔ احوال و کوائف کچھ اثر نہیں کرتی اور خارجی حالات کچھ ہی کیوں نہ ہوں وہ اپنے نصب العین کے حصول میں ہمیشہ ثابت قدم رہتے اور برابر آگے بڑھتے جاتے ہیں وبشر الصابرین الذین اذا اصابتھم مصیبۃ قالوا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ کامرانیوں کی بشارت ہے ان مستقل مزاج اور ثابت قدم صاحبانِ عزم و ہمت کے لئے جب کسی خارجی واقعہ سے دوچار ہوں اس کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرتے ہیں اور دل کے کامل اطمینان سے کہدیتے ہیں کہ ہماری زندگیاں نظامِ خداوندی کے قیام و بقا کے لئے وقف ہیں اور اس لئے ہماری تمام تگ و تاز اور سعی و عمل اسی محور کے گرد گردش کرتی ہے۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون)

اس کے بعد ہے:

اولئک علیھم صلوٰت من ربھم ورحمۃ

یہ ہیں وہ خوش بخت لوگ جن کے ساتھ اللہ کی تائید و نصرت ہے۔ جن کے کارناموں پر عالمِ بالا سے تحسین و تبریک کے غلغلے بلند ہوتے ہیں، جنہیں میزانِ خداوندی میں مدارجِ بلند کا مستحق قرار دیا جاتا ہے۔ علیھم صلوات من ربھم۔ غور کرو سلیم! اس مقام پر "علیھم صلوات" آیا ہے جس کا وہی مفہوم ہے جو "ھو الذی یصلی علیکم" کا ہے۔

کیوں سلیم! کچھ سمجھ میں آیا کہ "یصلی علیکم" کا قرآنی مفہوم کیا ہے؟ اب اس کے بعد اس آیۂ مقدسہ کی طرف پھر آجاؤ جس سے آغازِ کلام ہوا تھا۔ یعنی

(۱) ان اللہ وملائکتہ یصلون علی النبی۔

(۲) یا یھا الذین اٰمنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما۔

اس کے پہلے ٹکڑے کا مفہوم تو وہی ہے جو "ھو الذی یصلی علیکم" میں تمہارے سامنے آچکا ہے۔ یعنی نبی اکرمؐ ایک انقلابِ عظیم کا پروگرام لیکر مبعوث ہوئے۔ اس انقلاب کے لئے حضورؐ کی زندگی کا ایک ایک قدم آئین و قوانینِ خداوندی (قرآن) کے مطابق اٹھتا تھا اس لئے "اللہ اور اس کے ملائکہ" کی تائید و نصرت حضورؐ کے شاملِ حال تھی۔ اس نظام کو باقی تمام نظامہائے زندگی پر غالب آنا تھا۔

ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون (۹/۳۳)

اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسول کو راہ نمائی کا ضابطہ یعنی دین الحق دیکر بھیجا تاکہ وہ تمام نظامہائے عالم پر غالب آجائے خواہ یہ امر ان نظامہائے زندگی کے پرستاروں کو کتنا ہی گراں کیوں نہ گذرے۔

اللہ کی تائید تو بیشک حضورؐ کے شاملِ حال تھی۔ لیکن، جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، اس کے ساتھ ہی جماعتِ مومنین کی رفاقت و معیت بھی ضروری تھی۔ (حسبك الله واتبعك من المومنين)۔ اس کے لئے جماعتِ مومنین سے فرمایا کہ

یا ایھا الذین اٰمنوا صلوا علیه

اے جماعتِ مومنین، تمہاری تائید و نصرت بھی اس مقصد کے حصول میں نبی اکرمؐ (یعنی مرکزِ نظامِ امت) کے ساتھ ہونی چاہیئے۔ (صلوا علیہ) تم صرف اس خیال میں مست ہو کر نہ بیٹھ رہو کہ جب اللہ کی تائید و نصرت موجود ہے تو پھر ہمیں کچھ کرنے کی کیا ضرورت ہے! ایسا نہیں، اللہ کی تائید خود تمہاری تائید و ہمت سے مشروط ہے۔

ولینصرن الله من ینصرہٗ (۲۲/۴۰)

اللہ کی مدد اس کے ساتھ ہوتی ہے جو اس کے دین کی مدد کے لئے اٹھ کھڑا ہو۔

لہٰذا تمہارے لئے یہ ضروری ہے کہ تم اس امامتِ کبریٰ (نبی اکرمؐ) کے مشن کی کامیابی اور اس نظامِ خداوندی کی سربلندی کیلئے ہمیشہ مصروفِ سعی و عمل رہو۔ وتعزروہ وتوقروہ (۴۸/۹) اس کی مدد کرو، اس کی عظمت کو قائم رکھو۔ اس نظام کی بنیادوں کو مستحکم کردو۔ وتسبحوہ بکرۃ واصیلا (۳۳/۴۲) یعنی اس مقصدِ عظیم کے حصول کے لئے انتہائی جدوجہد اور تگ و تاز سے سرگرمِ عمل رہو۔ وعزروہ ونصروہ (۷/۱۵۷)۔ اس کی پوری پوری تائید و نصرت کرو۔ یہ ہے سلیم! مفہوم "یا ایھا الذین اٰمنوا صلوا علیہ" کا۔ اسے کہتے ہیں صلوٰۃ علی الرسول۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ رسول کی اس تائید و نصرت کا طریقہ کیا ہے۔ فرمایا:

وسلموا تسلیما

اس کی پوری پوری اطاعت کرو۔ مرکز کے احکام کے سامنے گردن جھکا دو۔ آپس میں قدم ملا کر چلو۔ اس ایک آواز پر سب کے سب جھکو اور سب کے سب اٹھو۔ لیکن اس حقیقت کو یاد رکھو کہ یہ اطاعت، رسول کی ذات کی اطاعت نہیں بلکہ اس ضابطۂ آئین کی اطاعت ہے جس کے مطابق نظام قائم کرنے کے لئے رسول کو بھیجا گیا ہے۔ چنانچہ سورۂ اعراف میں "وعزروہ ونصروہ" کے بعد فرمایا

واتبعوا النور الذی انزل معہٗ (۷/۱۵۷)

اور اتباع کرو اس روشنی کی جو اس رسول کے ساتھ نازل کی گئی ہے۔

لہٰذا یہ نظامِ اطاعت نبی اکرمؐ کے بعد بھی علیٰ حالہ قائم رہنا چاہیئے کیونکہ اطاعت درحقیقت قرآن کی ہے اور قرآن ہمیشہ کے لئے محفوظ رکھا گیا ہے۔

اب سلیم! ایک نظر پھر دیکھو اسی آیت کو۔

ان الله وملئکتہ یصلون علی النبی۔

اللہ اور اس کے ملائکہ کی تائید و نصرت نبی کے ساتھ ہے۔

یا ایھا الذین اٰمنوا صلوا علیہ

اے جماعتِ مومنین تم بھی اپنی تائید و نصرت اس نظام کی عظمت اور بلندی کے لئے رسول کے ساتھ رکھو جس کے قیام کے لئے وہ مصروفِ سعی و عمل ہے۔

وسلموا تسلیما

اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم کامل آہنگی سے اس کی پوری پوری اطاعت کرو۔

یہ تو ہے سلیم! اس کا قرآنی مفہوم۔ اور یہ ہے وہ مفہوم جو عجمی کارگہ فکر و سازش نے وضع کیا۔

اللہ اور اس کے فرشتے رسول اللہ پر درود بھیجتے ہیں۔

اے مسلمانو تم بھی رسول پر درود اور سلام بھیجا کرو۔

یعنی یہ پڑھتے رہا کرو۔ اللھم صل علیٰ محمد وعلیٰ اٰل محمد وبارک وسلم۔

غور کیا تم نے سلیم! کہ بات کیا تھی اور اندیشۂ عجم نے اسے کیا بنا دیا؟ اقامتِ صلوٰۃ جس سے مراد "خدا کے پیچھے پیچھے چلنے والے نظام" کا قیام تھا یعنی ایک ایسے ماحول اور معاشرہ کی تخلیق جس میں ہر فردِ معاشرہ میں صفاتِ خداوندی منعکس ہوں اور اس طرح انسانیت کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی چلی جائے، کارگہ عجم میں صرف "نماز پڑھنے" میں تبدیل ہو کر رہ گیا ہے۔ تلاوتِ قرآن جس سے مفہوم قرآن کے پیچھے چلنا تھا، فقط قرآن پڑھنے (بلکہ اس کی سطروں پر انگلیاں پھیرنے) میں بدل گیا۔ اور "صلوٰۃ علی المومنین وعلی النبی" جس سے مقصود قرآنی نظام کی تشکیل و استحکام میں سرگرم عمل رہنا اور اس طرح تحسین و تبریک خداوندی کا مورد بننا تھا، درود پڑھنے میں بدل گیا۔ علامہ مشرقی نے ایک مرتبہ لکھا تھا کہ مسلمانوں کا زوال اس وقت شروع ہوا جب ان کا دین لکھا جانے لگا۔ چنانچہ ان کے مقالے کا عنوان ہی "فتنۂ کتابت" تھا۔ اسی فتنے کا دوسرا گوشہ یہ تھا کہ تمام کرنے کے کام، پڑھنے (یعنی الفاظ دہرانے) کی چیزیں بنا دیئے گئے۔ نماز پڑھو۔ قرآن پڑھو۔ درود پڑھو۔ تسبیح پڑھو۔ فلاں وقت میں یہ دعا پڑھو۔ فلاں کام کے لئے یہ آیت پڑھو۔ حتیٰ کہ خدا کا "ذکر کرو" سے بھی یہ مراد ہو گیا کہ ہزار مرتبہ یا اللہ۔ یا اللہ یا بدوح کہو۔ عمر بھر ان الفاظ کو دہراتے رہو۔ انشاء اللہ نجات ہو جائے گی۔ تمہیں سلیم! بیری والی مسجد کے مولوی صاحب کا وعظ تو یاد ہو گا۔ وہ کس طمطراق سے کہا کرتے تھے کہ مسلمانو! کون کہتا ہے گناہ نہ کرو۔ گناہ کرو۔ خوب جی بھر کر گناہ کرو۔ لیکن اول و آخر درود شریف پڑھ لیا کرو۔ دونوں درود ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی طرح ملیں گے اور تمام گناہوں کو بہا کر لے جائیں گے۔ مرج البحرین یلتقیان۔ ممکن ہے یہ کہہ دیا جائے کہ یہ جہلا کی باتیں ہیں۔ "علمائے حقہ" ایسا نہیں کہتے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ زبان سے ایسا کچھ نہیں بھی کہتے عملاً وہ بھی یہی کچھ کرتے ہیں۔ ان میں کون ہے جو درود شریف پڑھنے کی فضیلت کا منکر ہے؟ جاہل ہو یا عالم ہر مسلمان کے دل کی گہرائیوں میں یہ عقیدہ راسخ ہے کہ درود شریف پڑھنے سے بڑا ثواب ہوتا ہے۔ اس کی بڑی برکتیں ہیں۔ رسول اللہ کی احادیث

اس پر شاہد ہیں۔ کتب تفاسیر اس سے بھری پڑی ہیں۔ بڑے بڑے بزرگان کرام ؒ کے ملفوظات میں اس کا تذکرہ ہے۔ ہر محراب و منبر پر اس کا چرچا رہتا ہے۔ اس لئے عوام ہوں یا خواص درود شریف کی برکات کا ہر شخص معترف ہے۔

اس کے ثواب اور برکات سے کسے انکار ہو سکتا ہے سلیم! لیکن یہ ثواب اور برکات، درود پڑھنے سے حاصل نہیں ہوتے۔ درود کرنے سے ہوتے ہیں۔ "الصلوٰۃ علی النبی" ایک عملی پروگرام کا نام ہے۔ وہ پروگرام جس کی تکمیل میں خود خدا کی رفاقت، اور نوامیس فطرت کی معاونت شریک کار ہوتی ہے۔ (ان اللہ وملئکتہ یصلون علی النبی) لیکن یہ رفاقت و معاونت، یہ تائید و نصرت صرف اسی صورت میں حاصل ہوتی ہے جب تم خود اس پروگرام کی تکمیل کے لئے سرگرم عمل ہو جاؤ (یا ایھا الذین اٰمنوا صلوا علیہ) اور اس کا ذریعہ ہے ملت کے اس اجتماعی مرکز کی اطاعت، جو قرآنی نظام کے قیام کا ضامن ہو (وسلموا تسلیما)۔ اور جو نوع انسانی کو ظلمات سے نکال کر نور کی طرف لے جائے۔

سوچو سلیم! "الصلوٰۃ علی النبی" کے اس قرآنی مفہوم کو نگاہوں سے اوجھل کر کے امت کو درود پڑھنے میں مشغول کر دینا، کتنی گہری سازش اور کیا ہمہ رنگ زمین دام تھا۔ اتنی بڑی سازش کہ میں جو کچھ اس خط میں لکھ رہا ہوں اگر خدانخواستہ کہیں "ارباب شریعت" کے کانوں تک پہنچ جائے تو ان کی بارگاہ جلال و قہرمانیت سے کفر و الحاد کے فتاوے صادر ہونے شروع ہو جائیں اور سر منبر مسجد قسم قسم کی گالیوں کی نشرگاہ بن جائے جن سے عوام کے جذبات کو یہ کہہ کر بھڑکایا جائے کہ دیکھو! یہ کمبخت اب درود سے بھی منکر ہو رہا ہے۔ یہ ذات رسالتمآب کی شان اقدس میں انتہائی گستاخی ہے! اب مدعیان عظمت و محبت رسول اللہ کو کون سمجھائے سلیم! کہ بارگہ رسالتمآبؐ میں گستاخی کون کر رہا ہے؟ ان بیچاروں میں اگر سمجھنے کی صلاحیت ہوتی تو جس علم رسالت کی سرفرازی و سربلندی کے متعلق، خود اللہ تعالیٰ نے کہا تھا کہ ورفعنا لک ذکرک، وہ علم آج اس طرح سرنگوں کیوں ہوتا؟ جس قرآنی نظام کے متعلق خدا کا ارشاد تھا کہ اسے تمام نظامہائے عالم پر غالب ہو کر رہنا ہے وہ آج اس طرح کس مپرسی کے عالم میں کیوں ہوتا؟ لہٰذا ان سے کچھ کہنا ہی بیکار ہے۔

جہاں میں بندۂ حُر کے مشاہدات ہیں کیا   تری نگاہ غلامانہ ہو تو کیا کہیئے

یہ تو تم کرید کرید کر پوچھتے رہتے ہو تو میں اتنا کچھ بھی لکھ دیتا ہوں ورنہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ قوم جو کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری ہے ابھی ان باتوں کے سننے کے لئے تیار ہی نہیں۔ لیکن اگر یہ قوم نہ سنے گی تو اس سے کیا بگڑتا ہے۔ یہ سننے کیلئے تیار نہیں ہیں تو نہ سنیں۔ دنیا قرآن کی آواز سنے گی کہ اس کے بغیر انسانیت کی بقا محال ہے۔

تو سلیم! اب خدا حافظ۔ درود کے متعلق تمہارا تقاضا پورا ہو گیا۔ اب اگر تم نے التحیات کی بات چھیڑ دی تو میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ تم تو انگلی پکڑتے پکڑتے پہنچا پکڑنے لگ جاتے ہو! والسلام

پرویز

نادر شاہ اور اتحاد سنی و شیعہ

(از علامہ اسلم صاحب جیراجپوری)

ہر چند کہ نادر شاہ اپنی سفاکیوں کی بدولت چنگیز خاں، ہلاکو اور تیمور وغیرہ کی فہرست میں مندرج ہے۔ لیکن باوجود ان خونریزیوں کے اس کے دل میں مسلمانوں کا درد تھا اور چاہتا تھا کہ اسلامی فرقے باہم متحد ہو جائیں۔

ایران میں شاہان صفویہ نے اپنے اغراض کے لئے خلفائے ثلثہ اور صحابۂ کرام کا سب و شتم رائج کر دیا تھا۔ نادر کو یہ دیکھکر سخت رنج ہوتا تھا کہ اس قبیح فعل کی وجہ سے ایرانی تمام عالم اسلامی کی دشمنی مول لے رہے ہیں۔ اور ان میں اور دیگر ممالک کے مسلمانوں مثلاً ہندوستانیوں، افغانیوں اور عثمانیوں میں عداوت کی خلیج زیادہ وسیع ہوتی جارہی ہے جس کی وجہ سے ہر وقت مصادمت کا خطرہ ہے۔

چنانچہ دشمنوں کو مغلوب اور ممالک کو مفتوح کرنے کے بعد ۱۱۴۸ھ میں صحرائے مغان میں جہاں امرائے ایران کا عظیم الشان اجتماع اس لئے ہوا تھا کہ اس کے سر پر ایران کی شہنشاہیت کا تاج رکھا جائے، اس نے کہا کہ

شاہ طہماسپ و شاہ عباس در عہد و سریر موجود اند۔ ایشاں را یا ہر کس را کہ برازندۂ افسر سروری دانند بریاست و سلطنت بردارند۔ ما آنچہ حق کوشش بود دریں چند سال بجا آوردیم و ولایات ایشاں را با امرائے ایشاں از دست افغان و روس و رومی خلاص کردیم۔ (تاریخ جہاں کشائے نادری ص۱۹۶)

سب لوگوں نے بالاتفاق کہا کہ اب ایران کا ایک بچہ بھی سوائے تمہارے کسی کی بادشاہی پر رضا مند نہیں ہے لیکن وہ برابر انکار کرتا رہا اس انکار و اصرار میں تقریباً ایک مہینے کا عرصہ گزر گیا اور جب لوگوں نے اس کا دامن نہ چھوڑنا چاہا تو اس نے کہا:۔

از زمان رحلت حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم چہار خلیفہ بعد از یکدگر متکفل امر خلافت شدہ اند کہ ہند و روم و ترکستان ہمگی بخلافت ایشاں قائل اند و در ایران ہم سابقاً ہمیں مذہب رائج و متداول بود۔ شاہ اسمٰعیل صفوی در مبادی حال بنا بر صلاح دولت خود ایں مذہب را متروک و مذہب تشیع را مسلوک داشتہ بعلاوہ آں سب و رفض را کہ فعل بیہودہ و مایۂ مفاسد است در السنہ و افواہ عوام و اوباش دائر و جاری کردہ شرر شرارت بچقماق زدو برہم زنی انگیخت و خاک ایران را بخون فتنہ و فساد آمیخت و مادام کہ ایں فعل مذموم انتشار داشتہ باشد ایں مفسدہ از میان اہل اسلام رفع نخواہد شد۔ ہرگاہ اہالی ایران بسلطنت ما راغب و آسائش خود را طالب باشند باید کہ ایں ملت را کہ مخالف مذہب

اسلاف کرام ماست تارک و بمذہب اہل سنت وجماعت سالک شوند۔ لیکن چوں حضرت امام جعفر صادق ذریۂ رسول اکرمؐ و ممدوح امم ہستند وطریقۂ اہلِ ایران بمذہب آنحضرت آشنا ست او راس مذہب خود ساختہ در فروعات مقلد طریقہ واجتہاد آنحضرت باشند۔ (تاریخ جہاں کشائے نادری ص ۱۹۷)

اہل ایران نے اس کی بات قبول کرلی اور محضر لکھ کر سب نے اس پر مہر لگائی۔ اس وقت نادر نے ایران کا تخت قبول کیا اور کہا کہ چونکہ بادشاہ روم خلیفۂ اسلام ہے اس لئے میں یہ تمام سرگذشت لکھ کر اس کے دربار میں بھیجتا ہوں تاکہ باہم مصالحت اور دوستی قائم ہوجائے اور اختلافات مٹ جائیں۔ نیز میں اس سے پانچ باتوں کی درخواست کروں گا۔

(۱) چونکہ اہل ایران اپنے سابقہ عقائد سے جو موجب عداوت تھے تائب ہوگئے اس لئے خلیفہ وعلماء و قضاۃ عثمانی سے درخواست ہے کہ مذہب جعفری کو ایک پانچواں مذہب شمار کرکے اس کی صحت تسلیم کرلیں۔

(۲) کعبہ میں جہاں چار مصلے قائم ہیں وہاں ایک مصلے جعفری مذہب کا بھی قائم کردیا جائے تاکہ ایران کے لوگ اس مصلے پر اپنے امام کے پیچھے نماز ادا کرسکیں۔

(۳) ایرانی قافلہ حجاج کسی ایرانی ہی میرحاج کی قیادت میں ہر سال مکہ جایا کرے اور عثمانی امراء اس کے ساتھ بھی وہی مراعات برتیں جو دوسرے ممالک مثلاً مصر یا شام کے قافلہ حجاج کے ساتھ مرعی رکھتے ہیں۔

(۴) دونوں دولتوں ایران وروم میں سے ہر ایک دولت کے پاس دوسرے کے جو اسیران جنگ ہوں وہ آزاد رکھے جائیں غلام نہ بنائے جائیں۔

(۵) دونوں دولتوں کی طرف سے قنصل ایک دوسرے کے پایۂ تخت میں رہا کریں تاکہ باہمی معاملات آسانی کے ساتھ طے ہوتے رہیں۔

نادر نے تخت نشین ہونے کے بعد بار بار سفیر عثمانی دربار میں بھیجے۔ مگر وہاں سے اس کے حسب منشا جواب نہ ملا۔ ۱۱۵۶ھ میں اس نے تیسری بار بغداد پر یورش کی تو وہاں کے والی احمد پاشا کے پاس برابر پیغام بھیجتا رہا کہ اس کے مطالبات تسلیم کئے جائیں۔ اس درمیان میں اس نے کرکوک وغیرہ کے متعدد قلعے فتح کرلئے لیکن بغداد کو نہ لے سکا۔ آخر اس کے محاصرہ پر ایک کثیر فوج چھوڑ کر خود نجف اشرف کی زیارت کو چلا گیا۔ اور وہاں ایک عرصہ تک معہ لشکر و درگاہ وخیمہ وخرگاہ کے قیام رکھا۔

چونکہ صحرائے مغان کے عہد کی پوری تعمیل ابھی تک نہیں ہوئی تھی اور ہندوستان، افغانستان، ترکستان اور ایران کے مختلف الخیال مسلمان ایک دوسرے کی تکفیر سے باز نہیں آئے تھے، اس لئے اس نے تمام قلمرو میں فرمان بھیجا کہ مفتیان، علماء، امراء، اور رؤسا ہر ملک اور ہر طبقے کے دربار میں حاضر ہوں جب چہار سمت سے یہ لوگ نجف میں آگئے تو اس نے ان سب سے پھر صحرائے مغان کے عہد کی تجدید چاہی اور ہر فرقے کے علماء سے کہا کہ تم آپس کے تفرقے مٹا ڈالو۔ میں کسی طرح یہ جائز نہیں رکھ سکتا کہ میری سلطنت کے مسلمان باہم ایک دوسرے کو کافر بنائیں۔ اس نے احمد پاشا والی بغداد کے پاس لکھا کہ کسی ایسے ممتاز ومعتبر عالم کو بھیجدے جو ہمارے ان علماء کو ایک مرکز پر لاکر متحد کرسکے اور ان کے اختلافات کو مٹانے میں بطور حکم عادل کے شاہد رہے۔

احمد پاشا نے علامہ عبداللہ سویدی کو جو اس زمانے میں بغداد کے سب سے نامور عالم تھے اس کام کے لئے منتخب کیا اور

نادرشاہ کے پاس بھیجا۔

علامہ موصوف نے وہ تمام باتیں جو اس مرحلہ میں پیش آئیں یا جو بحثیں ان کو کرنی پڑیں خود قلمبند کی تھیں مصر کے ایک مطبع نے اس کو الحجج القاطعۃ فی اتفاق الفرق الاسلامیہ کے نام سے شائع کیا ہے۔ ہم اس کا خلاصہ درج کرتے ہیں۔ اسلم

---

۱۲ شوال ۱۱۵۶ھ یکشنبہ کے دن مغرب سے قبل میں اپنے گھر میں بیٹھا تھا کہ احمد پاشا والی بغداد کا ایک آدمی میرے بلانے کو آیا۔ میں مغرب کی نماز پڑھ کر والی موصوف کے دربار میں گیا۔ وہاں ان کا ندیم احمد آغا ملا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ پاشا نے آپ کو کیوں طلب کیا ہے؟ میں نے کہا کہ نہیں۔ بولا کہ پاشا آپ کو نادرشاہ کے حسب طلب اس کے دربار میں بھیجنا چاہتا ہے۔ جہاں ہر طرف سے علمائے عجم آ کر جمع ہوئے ہیں۔ آپ کو ان کے ساتھ مذہب تشیع کے متعلق بحث کرنی ہوگی۔ اگر وہ غالب آگئے تو پھر پانچویں مذہب جعفری کی صحت کو تسلیم کر لینا پڑے گا۔

میں نے جو یہ بات سنی تو میرا بدن کانپ اٹھا اور کہا کہ احمد آغا! تم کو خوب معلوم ہے کہ نادر سخت جابر اور بڑا سفاک ہے۔ اس کے دربار میں علمائے عجم کے ساتھ جو اس کے ہم مذہب ہیں میں کس طرح بحث کر سکوں گا اور کیسے ان کے عقائد کے ابطال پر دلائل قائم کرنے کی جرأت کروں گا کیونکہ وہ نہ ہماری حدیث کو مانتے ہیں نہ قرآن کی تاویل کو۔ پھر جب اصول موضوعہ اور علوم متعارفہ ہمارے اور ان کے ایک نہیں ہیں تو بحث کس بنیاد پر ہوگی؟ مثلاً فرض کرو کہ میں مسح علی الخفین (موزوں پر مسح) کے جواز پر یہ دلیل پیش کروں کہ اس کو ۷۰ صحابہ نے روایت کیا ہے۔ جن میں سے حضرت علیؓ بھی ہیں وہ کہیں گے کہ عدم جواز کی روایتیں ہمارے یہاں ۱۰۰ اصحابیوں سے مروی ہیں۔ جن میں سے ابوبکر بھی ہیں۔ علیٰ ہذا ایک آیت کی تاویل بیان کر کے میں کسی روایت کی سند دوں گا تو وہ اس کے خلاف تاویل بیان کر کے اس کی سند کسی دوسری روایت سے دیں گے لہٰذا جس طرح ممکن ہو احمد پاشا سے کہو کہ مجھے اس کام کے لئے نہ بھیجیں بلکہ حنفی یا شافعی مفتیوں میں سے کسی کو روانہ کریں۔ آغا نے کہا کہ یہ ناممکن ہے اور بہتر یہ ہے کہ اس میں آپ مطلق لب کشائی نہ کریں، کیونکہ پاشا نے آپ کو بھیجنے کا قطعی فیصلہ کر لیا ہے۔ یہ سن کر میں دم بخود ہوگیا۔ اس کے بعد خود احمد پاشا آگیا۔ اس نے سارا حال سنا کر مجھے شاہ کے پاس جانے کا حکم دیا اور کہا مجھے اللہ سے امید ہے کہ تمہاری حجت کو قوی کرے گا اور تم کو غلبہ عطا فرمائے گا۔ میں نے کہا لیکن نادرشاہ کی حالت تو آپ اچھی طرح سن چکے ہیں۔ پاشا نے کہا کہ ہاں۔ میں تم کو اس بارے میں آزاد چھوڑتا ہوں۔ موقع دیکھنا تو مناظرہ کرنا ورنہ باز رہنا۔ لیکن گریز کلیتہً نہ ہونی چاہئے بلکہ مناسب طریقے سے ان کا ابطال کرنا۔ ایسا نہ ہو کہ مغلوب ہو کر ان کے مذہب کی صحت تسلیم کر لو۔ پھر کہا کل دوشنبہ ہے۔ چہارشنبہ کی صبح کو تم کو شاہ کے پاس موجود ہو جانا چاہئے۔ اس لئے کل ہی صبح روانہ ہو جاؤ۔ اس کے بعد اس نے میرے لئے ایک خلعت کا حکم دیا اور سواری و خدام وغیرہ کا بندوبست کر دیا۔ دوسرے دن سویرے میں ان عجمیوں کے ساتھ جو بادشاہ کے یہاں سے آئے تھے روانہ ہوگیا۔ راستہ بھر اسی خیال میں غرق رہا۔ دلائل سوچتا تھا اور اس کے جواب۔ پھر جواب الجواب۔

یہانتک کہ ہجوم افکار سے میرا سر چکرانے لگا اور شام کو جب مجھے پیشاب آیا تو سرخ خون کی طرح۔

اب ہم حلہ ابن مزید میں پہنچے۔ یہ آبادی اس وقت ایرانیوں کے قبضے میں آچکی ہے۔ یہاں چند اہل سنت والجماعت سے ملاقات ہوئی جن کی زبانی معلوم ہوا کہ شاہ نے ایران کے ۷۰ مفتی جمع کئے ہیں جو سب کے سب شیعہ ہیں اور مذہب جعفری کی صحت پر دلائل پیش کریں گے۔ یہ بات سن کر مجھے اور پریشانی ہوئی۔ پھر میں نے سوچا کہ میں تو مختار ہوں بحث نہ کروں گا لیکن میں نے دیکھا کہ میرا دل ترک بحث پر مطلقاً راضی نہیں ہوتا۔ اب میں سوچنے لگا کہ صاف صاف کہونگا کہ اگر بحث منظور ہے تو کسی ایسے ثالث کے سامنے ہو جو نہ سنّی ہو نہ شیعہ۔ ہاں ورنہ میں مناظرہ کروں گا خواہ اس میں میرے قتل ہی تک نوبت کیوں نہ پہنچے۔ وہاں سے چل کر ہم شہر ذی الکفل میں آئے اور آبادی سے باہر ہی ٹھہر کر کچھ دیر آرام لیا۔ رات کے پچھلے پہر روانہ ہوگئے اور ہبر دندان میں پہنچ کر فجر کی نماز پڑھی۔ فارغ ہوتے ہی نادر شاہ کا ایک قاصد دوڑتا ہوا آیا اور کہا کہ جلد چلئے آپ کا انتظار ہے۔ اس مقام سے شاہ کا مخیم دو فرسخ ہے۔ میں نے پوچھا کہ کیا شاہ کا یہی دستور ہے کہ جب کوئی آتا ہے تو اس کے استقبال کے لئے قاصد دوڑتا ہے یا صرف اس موقع پر ایسا کیا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ کبھی نہیں بلکہ لوگ آتے بھی ہیں تو عرصے تک ان کو باریابی نصیب نہیں ہوتی۔ راستہ سے بجز آپ کے آج تک شاہ نے کسی کو نہیں بلایا۔ میں نے اپنے دل میں سوچا کہ اس عجلت سے بلانے کی غرض یہ ہوسکتی ہے کہ مجھ کو مذہب جعفری قبول کرنے پر مجبور کرے۔ پہلے ممکن ہے کہ دنیاوی لالچ دلائے۔ اگر میں نے اس کو قبول نہ کیا تو پھر سختی سے کام لے گا بہت کچھ استغفار توبہ اور لاحول وغیرہ پڑھنے کے بعد میں نے اپنے دل میں یہ طے کرلیا کہ حق کا دامن نہیں چھوڑوں گا۔ دین اسلام پہلی بار اس وقت رک گیا تھا جب رسول اکرمؐ کی وفات کے بعد ردّت کے معاملہ میں صحابہؓ نے ابوبکرؓ کو تنہا چھوڑ دیا تھا۔ اللہ نے انھیں کی بدولت اس کو چلایا۔ پھر دوسری بار اس وقت رکا جب خلیفہ مامون نے علماء کو خلقِ قرآن پر مجبور کیا اس وقت احمد بن حنبلؒ جیسا امام کھڑا ہو گیا، جس نے اس کو آگے بڑھایا۔ آج اگر میں بھی ان ہی مثالوں کی پیروی کروں تو کیا عجب ہے کہ حق قائم رہ جائے۔ ورنہ میرے ساتھ لاکھوں مسلمان گمراہ ہوجائیں گے۔

آخر میں موت کے لئے ہر طرح پر تیار ہو کر کلمہ توحید و شہادت پڑھتا ہوا روانہ ہوا۔ کچھ دیر کے بعد دو اونچے اونچے جھنڈے نظر آنے لگے۔ معلوم ہوا کہ یہی شاہی معسکر ہے۔ وہاں پہنچکر دیکھا کہ بڑے بڑے سات ستونوں پر شاہی خیمہ کھڑا ہے۔ راستہ پر کشک خانہ ہے جس میں پندرہ پندرہ خیمے بالمقابل کھڑے کئے گئے ہیں۔ شاہی خیمہ کے متصل رواق (شامیانہ) ہے۔ دائیں سمت میں چار ہزار سپاہی حفاظت کیلئے رہتے ہیں اور بائیں سمت میں خالی خرگاہیں ہیں جن میں کرسیاں وغیرہ رکھی ہیں۔

جب کشک خانہ کے قریب آیا تو وہاں ایک درباری میرے استقبال کے لئے نکلا۔ اس نے مجھ سے بغداد کے امراء رؤسا اور احمد پاشا اور اس کے متعلقین کے حالات نام بنام پوچھنے شروع کئے۔ میں اس کی واقفیت سے حیران ہوا۔ اس نے میرے تعجب کو دیکھکر کہا کہ شاید آپ مجھے نہیں پہچانتے میرا نام عبدالکریم بیگ ہے۔ میں مدتوں بغداد میں احمد پاشا کے پاس رہا ہوں۔ آج کل دولتِ عثمانیہ کی طرف سے شاہ کے پاس سفارت لیکر آیا ہوں۔ اسی اثناء میں نو اشخاص ہماری طرف آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ عبدالکریم ان کی تعظیم کیلئے

کھڑا ہوگیا۔ ان لوگوں نے مجھے سلام کیا۔ میں نے جواب دیا۔ عبدالکریم نے ان سب سے مجھ کو ملایا اور یکے بعد دیگرے ان کا تعارف کرانا شروع کیا کہ یہ حسن خاں معیار الممالک ہیں۔ یہ مصطفےٰ۔ یہ نظر علی خاں، یہ مرزا ذکی اور یہ مرزا کاظم۔

معیار الممالک جو کرجی الاصل اور شاہ حسین کے موالی میں سے ہے نادر شاہ کا وزیر ہے۔ سرسری ملاقات کے بعد یہ لوگ مجھے شاہ کے دربار میں لے چلے۔ شامیانے کے دروازے پر پہنچکر پردہ اٹھایا گیا۔ ان لوگوں نے مجھ سے کہا کہ جب ہم چلیں تو آپ بھی چلیں اور جب ہم ٹھہر جائیں تو آپ بھی ٹھہر جائیں۔ شامیانے سے گزرگئے تو ایک طرف کشادہ جگہ دیکھی وہاں حرم کے خیمے تھے۔ سامنے ایک شاندار خیمے میں نادر کرسی پر بیٹھا ہوا نظر آیا جب اس کی نگاہ مجھ پر پڑی تو بلند آواز سے کہا، خوش آمدید عبداللہ آفندی۔ پھر قریب آنے کا حکم دیا۔ خوانین میرے دائیں طرف تھے اور عبدالکریم بائیں طرف۔ ہم سب دس قدم چل کر رک گئے۔ پھر شاہ نے کہا اور آگے آؤ۔ الغرض اسی طرح ہم چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر چلتے اور رکتے اس کے پاس پہنچ گئے۔ جب صرف پانچ ہاتھ فاصلہ رہ گیا تو ٹھہر گئے۔

شاہ کا قد بلند ہے۔ چہرے سے بڑھاپا ٹپکتا ہے۔ آگے کے چند دانت بھی گر گئے ہیں۔ عمر تقریباً اسّی سال کی معلوم ہوتی ہے۔ ڈاڑھی حنا اور وسمہ سے رنگی ہوئی ہے۔ دونوں ابرو کمان کی طرح کشیدہ ہیں اور آنکھوں سے زردی نمایاں ہے۔ ایک سفید چوگوشہ کلاہ عجمی سر پر ہے جس پر عمامہ ہے جو موتی، یاقوت، الماس اور ہر قسم کے جواہر سے مزین ہے گلے میں موتی کے ہار ہیں اور قبا کے دونوں مونڈھوں پر جواہرات ٹکے ہوئے ہیں۔ الغرض وہ اپنی شکل و لباس کے باعث پر تمکنت و جلال معلوم ہوتا ہے۔ جب میں نے قریب سے اس کو دیکھا تو وہ تمام رعب جو اس کا میرے دل پر بیٹھا ہوا تھا جاتا رہا۔ اس نے ترکی زبان میں میرے ساتھ گفتگو شروع کی۔ پہلے احمد خاں (پاشا) کی خیریت دریافت فرمائی۔ پھر کہا کہ آپ کو معلوم ہے کہ میری سلطنت میں ترکستان و افغانستان بھی ہیں وہاں کے لوگ ایرانیوں کو کافر کہتے ہیں اور ایرانی ان کو کافر سمجھتے ہیں حالانکہ سب ایک ہی امت کے ہیں اور ایک ہی دین کے پیرو۔ اس لئے میں نہیں چاہتا کہ میری سلطنت میں ایسے مسلمان رہیں جو ایک دوسرے کو کافر بنائیں۔ میں نے آپ کو اسی غرض سے طلب کیا ہے کہ میری طرف سے وکیل بن کر ان کے باہمی تکفرات کو رفع کر دیجئے اور ہر فرقہ کو پابند کر دیجئے کہ وہ ان امور سے باز آجائے جن سے کفر عائد ہوتا ہے تاکہ کوئی ان کو کافر نہ بنا سکے جو کچھ آپ دیکھیں اور سنیں اس کو مجھ سے بھی آکر کہیے اور بغداد پہنچنے پر احمد پاشا کو بھی سنائیے۔

اس کے بعد ہم کو وہاں سے واپسی کی اجازت ملی اور میری میزبانی کے لئے اعتماد الدولہ نامزد کئے گئے۔ میں وہاں سے نہایت خوش ہو کر نکلا کیونکہ میرا جو خطرہ تھا اس کے برخلاف شاہ نے سارے مذہبی اختیارات میرے ہاتھ میں دیدیئے۔ اب ہم اعتماد الدولہ کی طرف روانہ ہوئے۔ نظر علی خاں عبدالکریم بیگ اور ابوذر بیگ جو تینوں میری خدمت کے لئے مامور تھے ساتھ ساتھ چلے۔ اعتماد الدولہ خیمہ میں بیٹھا ہوا تھا میں نے اس کو سلام کیا۔ اس نے جواب دیا لیکن بدستور بیٹھا رہا۔ میرے دل میں اس سے سخت انفعال اور غصہ پیدا ہوا کہ اس شخص نے اپنی رعونت سے علم اور اہل علم کی اہانت کی اور میں سوچنے لگا کہ جب کہ نادر شاہ نے جملہ تکفرات کے اٹھا دینے کا وکیل مطلق مجھے بنا دیا ہے، میں اس سے اس کی شکایت ضرور کروں گا اور اس کفر کو جو اسلامی شان کے بالکل خلاف ہے سب سے پہلے مٹاؤں گا۔ مگر جونہی کہ میں بیٹھ چکا اعتماد الدولہ کھڑا ہوا اور اس نے ادب سے دونوں ہاتھ سینے پر

رکھے اور میری طرف جھکتا ہوا مرحبا کہہ کر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ میں سمجھ گیا کہ ایرانیوں کا تعظیمی دستور یہی ہے۔ لہٰذا اب اس کی طرف سے کوئی شکایت مجھے نہیں رہی۔

اعتماد الدولہ دراز قامت، سفید رو، اور کشادہ چشم ہے۔ ڈاڑھی پر حنا اور وسمہ کا خضاب کرتا ہے۔ عاقل نرم خو اور خلیق ہے۔

جب کھانے سے فارغ ہو چکے تو حکم آیا کہ میں مُلّا باشی (درباری علامہ ملا علی اکبر) سے ملوں۔ میں سوار ہوا۔ میزبانوں کی جماعت رفاقت میں تھی۔ راستہ میں ایک شخص افغانی لباس میں ملا۔ اس نے سلام کیا۔ میں نے پوچھا کہ آپ کون ہیں؟ بولا کہ ملا حمزہ افغانستان کا مفتی۔ میں نے کہا کہ شاہ نے مجھ کو وکیل مطلق بنایا ہے کہ ایرانیوں سے ہر قسم کے تکفرات اٹھا دوں۔ تم چونکہ سُنّی ہو اس لئے میں تم سے امید رکھتا ہوں کہ اگر وہ کوئی فعل اس قسم کا کرتے ہوں جو منجر بہ کفر ہو اور مجھ سے اس کو چھپائیں تو مجھے مطلع کر دینا کیونکہ میں ان کے حالات، عقائد اور عبادات سے اسقدر واقف نہیں ہوں جس قدر کہ تم لوگ ہو۔

مُلّا حمزہ نے کہا کہ آپ شاہ کی باتوں سے دھوکے میں نہ آجائیں درحقیقت اس نے آپ کو ملا باشی کے پاس اس غرض سے بھیجا ہے کہ وہ مناظرہ کرے۔ ایران کے تمام علماء اس کا ساتھ دینگے۔ لہٰذا آپ ہوشیار رہیں۔ میں نے کہا کہ مجھے بحث کا زیادہ خطرہ نہیں ہے۔ صرف ڈر یہ ہے کہ وہ ناانصافی نہ کریں یا جو کچھ مجلس مناظرہ میں میں کہوں اس کے خلاف شاہ سے جا کر بیان کر دیں۔ اس نے کہا کہ اس سے آپ خاطر جمع رہیں۔ اس مجلس میں شاہ کے مخبر ہیں۔ پھر ان مخبروں پر مخبر ہیں۔ ان کے علاوہ خاص جاسوس ہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ ایک لفظ بھی خلاف واقعہ شاہ کے سامنے کوئی بیان کر سکے۔

اب ہم ملا باشی کے خیمہ کے قریب پہنچ گئے۔ وہ منتظر تھا۔ استقبال کے لئے نکلا۔ گندم گوں اور پستہ قد آدمی ہے۔ مجھ کو لیجا کر صدر پر بٹھایا اور خود سامنے شاگردوں کی طرح ادب کے ساتھ بیٹھ گیا۔ مجمع کثیر تھا۔ ہر ملک کے علما جمع تھے۔ پہلے اس نے مجھ سے رسمی باتیں کیں۔ اس کے بعد افغانی مفتی کو مخاطب کر کے کہا کہ تم نے ہادی خواجہ (قاضی بخارا) کو دیکھا؟ اس نے جواب دیا کہ ہاں ــــ ملا باشی نے کہا کہ مجھے تعجب ہے کہ اس نے اپنا لقب بحر العلم کیوں رکھا ہے اس کو تو علم سے ذرا بھی مس نہیں۔ بخدا اگر میں حضرت علیؓ کی خلافت کے متعلق دو دلیلیں بھی بیان کروں تو وہ ان کا جواب نہیں دے سکے گا۔ اور وہ کیا اہل سنت کے علما رفول سے بھی ان کا جواب بن نہ پڑے گا۔ اس آخری جملہ کو اس نے تین بار دہرایا۔ اس لئے لازم آگیا کہ میں ان دونوں دلیلوں کو پوچھوں اور ان کے جو جواب ہو سکتے ہیں پیش کروں۔

میں: جناب ذرا میں بھی سنوں کہ حضرت علیؓ کی خلافت کے ثبوت میں آپ کی وہ کونسی دو دلیلیں ہیں جن کا جواب آپ کے خیال میں کسی بڑے سے بڑے سنّی عالم سے بھی نہیں ہو سکتا۔

مُلّا باشی: میں آپ سے پہلے یہ پوچھ لینا چاہتا ہوں کہ آنحضرتؐ کا یہ قول حضرت علیؓ کے متعلق آپ کے یہاں مسلّم ہے یا نہیں کہ انت منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ الا انہ لا نبی بعدی (تم میرے ساتھ وہ نسبت رکھتے ہو جو ہارونؑ کو موسیٰؑ کے ساتھ تھی مگر یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔)

میں: ہاں یہ حدیث مشہور ہے۔

ملا باشی: تو کیا اس حدیث کا منطوق و مفہوم صریحاً اس امر پر دلالت نہیں کرتا کہ خلیفۂ برحق علی ابن ابی طالبؓ ہیں؟

میں: دلیل کی صورت معرض بیان میں لائیے۔

ملا باشی: جب آنحضرتؐ نے ہارونؑ کے تمام منازل و مراتب حضرت علیؓ کے لئے فرما دیئے اور ان میں سے کوئی چیز بجز نبوت کے مستثنیٰ نہ کی تو ثابت ہو گیا کہ خلیفۂ برحق حضرت علیؓ ہیں کیونکہ ہارونؑ کا اولیں مرتبہ تو خلافت ہی تھا اگر وہ زندہ رہتے تو ضرور حضرت موسیٰؑ کے بعد ان کے خلیفہ ہوتے۔

میں: آپ کے اس کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس کو قضیہ موجبہ کلیہ سمجھتے ہیں لہٰذا یہ بتائیے کہ اس ایجاب کلی پر کونسا لفظ دلالت کرتا ہے کہ ہارونؑ کے تمام منازل حضرت علیؓ کو حاصل ہیں۔

ملا باشی: اس لئے کہ منزلتھا رون میں جو اضافت ہے وہ بقرینہ استثنا استغراقی ہے۔

میں: سنئے یہ حدیث اولاً تو نص جلی نہیں ہے اور آپ کے یہاں امامت یا خلافت کیلئے نص جلی درکار ہے۔ ثانیاً محدثین نے اس کے متعلق اختلافات کئے ہیں کسی نے اس کو صحیح کہا ہے کسی نے حسن اور کسی نے ضعیف۔ یہانتک کہ ابن جوزی نے جو نقد حدیث کا بہت بڑا امام ہے اس کو قطعاً موضوع قرار دیا ہے۔

ملا باشی: نص جلی ہمارے یہاں شرط ہے نہ کہ آپ کے یہاں۔ سوم حضرت علیؓ کی خلافت کیلئے دوسری حدیثیں پیش کرتے ہیں جو نص جلی ہیں لیکن چونکہ اہلِ سنت کے نزدیک وہ نامقبول ہیں اسلئے ان کے واسطے اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔

میں: یہ حدیث مختلف وجوہ سے دلیل نہیں بن سکتی۔ اولاً یہ کہ استغراق کا دعوی جو آپ نے کیا وہ ممنوع ہے۔ کیونکہ ہارونؑ حضرت موسیٰؑ کے ساتھ نبی تھے اور حضرت علیؓ میں یہ بات نہ تھی حالانکہ استثنا تو نبوت بعد از وفات کا ہے ثانیاً ہارونؑ حضرت موسیٰؑ کے ماں جائے بھائی تھے اور حضرت علیؓ نبی کے ساتھ یہ رشتہ نہیں رکھتے تھے۔ لہٰذا استغراق کا دعوی تو قطعاً باطل ہوا۔ اب اس کی دلالت ظنی رہ گئی جو اصولاً صرف ایک منزلت پر ہوگی۔ جیسا کہ منزلتہ کی تانیث سے خود ظاہر ہے اس لئے یہ اضافت عہد ہے نہ کہ استغراق اور مقصود یہ ہے کہ علیؓ خلافت جنگ تبوک میں میرے ساتھ وہی نسبت رکھتے ہیں جو حضرت ہارونؑ کو حضرت موسیٰؑ کے ساتھ اس وقت تھی جب انھوں نے حکم دیا تھا اخلفنی فی قومی (میری قوم میں میری جانشینی کر)

ملا باشی: تو پھر کیا اس استخلاف سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ صحابہ میں افضل تھے اور نبی کے بعد ان کی جانشینی کے سب سے زیادہ مستحق۔

میں: نہیں۔ کیونکہ حضرت علیؓ کے علاوہ اور صحابہؓ کو بھی آپ نے اپنی جانشینی کا زندگی میں شرف بخشا ہے۔ مثلاً ابن ام مکتوم وغیرہ کو پھر وہ بھی بعد وفات کے اس دلیل سے خلافت کے سب سے زیادہ مستحق ہوں گے علاوہ بریں اگر یہ استخلاف کوئی فضیلت

ہوئی تو حضرت علیؓ اس پر ناراضی کا اظہار نہ کرتے جیسا کہ انھوں نے کہا کہ آپ مجھ کو کمزوروں، بچوں اور بوڑھی عورتوں کے ساتھ چھوڑتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ان کی اس کبیدگی کو دفع کرنے کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فقرہ "انت منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ" فرمایا تھا۔

ملاباشی: لیکن لحاظ عموم لفظ کا ہوتا ہے نہ کہ خصوص سبب کا۔

میں: خصوص سبب کو میں نے دلیل نہیں گردانا ہے بلکہ اس کو قرینہ بتلایا ہے کہ یہاں ایک منزلت جو مراد ہے اس سے صرف وہی خلافت مخصوصۂ جنگ تبوک ہے نہ کہ اور کوئی خلافت۔

اس کے بعد ملاباشی خاموش رہ گیا اور اس کے کثیر طرفدار علماء میں سے بھی جو اس کی حمایت کے لئے پس پشت بیٹھے ہوئے تھے کوئی آواز بلند نہ ہوئی۔ اب اس نے اپنی دوسری دلیل شروع کی اور کہنے لگا کہ میری دوسری دلیل تو ایسی ہے کہ اس میں قطعاً کسی تاویل کی گنجائش نہیں۔

میں: اس کو بھی بیان فرمائیے۔

ملاباشی: وہ آیت مباہلہ ہے: قُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ (کہدے کہ آؤ ہم بلائیں اپنے بیٹوں کو اور تمہارے بیٹوں کو اور اپنی عورتوں کو اور تمہاری عورتوں کو اور اپنے آپ کو اور تم کو پھر مباہلہ کریں)۔

میں: استدلال کی شکل بیان کیجئے۔

ملاباشی: جب نجران کے نصاریٰ مباہلہ کے لئے آئے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے گود میں حسینؓ کو اٹھایا حسنؓ کا ہاتھ پکڑا۔ پیچھے فاطمہؓ تھیں اور ان کے پیچھے علی رضی اللہ عنہم۔ ظاہر ہے کہ دعا کے لئے وہی لوگ منتخب ہو سکتے ہیں جو سب سے افضل ہوں۔

میں: یہ منقبت ہوئی نہ کہ فضیلت۔ اکثر صحابہ بعض خصوصیات سے مختص ہیں جو دوسروں میں نہیں ہیں اور یہ باتیں ان لوگوں سے مخفی نہیں ہیں جو تاریخ و سیر کا مطالعہ کرتے ہیں مگر یہ خصوصیات فضیلت کی دلیل ہرگز نہیں ہو سکتیں۔ فرض کرو کہ دو قبیلوں میں جنگ ہو۔ ان دونوں کے رؤسا صرف اپنے اپنے خاص خاص متعلقین کو ساتھ لیکر مبارزہ کریں تو یہ دلیل اس امر کی نہیں ہو سکتی کہ ان قبیلوں میں ان رؤسا کے خاص عزیزوں سے بڑھ کر کوئی بہادر نہ تھا اور یہ چونکہ دعا کا موقع تھا جس میں خاص متعلقین کی موجودگی سے خشوع زیادہ بڑھ جاتا ہے اسلئے مقتضائے مقام یہی تھا کہ آنحضرت انھیں حضرات کو اپنے ساتھ لیجاتے

ملاباشی: ہاں تو خشوع نتیجہ ہے فرطِ محبت کا اور ہم یہی تو ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ آنحضرتؐ کو یہی حضرات سب سے زیادہ محبوب تھے۔

میں: یہ طبعی اور جبلی محبت ہے نہ کہ اختیاری جس سے کوئی فضیلت ثابت ہو سکے۔ انسان یہ یقین رکھتے ہوئے کہ اس کے بیٹوں یا خاص عزیزوں سے دوسرے لوگ ہر لحاظ سے افضل ہیں پھر بھی طبعاً ان کی محبت پر مجبور ہے اور یہ ایسی بات ہے جس کو سب جانتے ہیں۔

ملا باشی: حقیقت یہ ہے کہ اس آیت میں ایک خاص نکتہ ہے جس کی وجہ ہم حضرت علیؓ کی افضلیت کی دلیل اس کو سمجھتے ہیں وہ یہ کہ ابنائنا سے مراد ہیں حسنؓ و حسینؓ، نسائنا سے فاطمہؓ اور انفسنا سے آنحضرتؐ اور علیؓ۔ اس لئے حضرت علیؓ نفس نبی ہوئے اور یہ انتہائی فضیلت ہے۔

میں: یہ تو میں پہلے سمجھ گیا تھا کہ تم اصول سے ناواقف ہو لیکن اب معلوم ہوا کہ عربیت سے بھی ناآشنا ہو۔ سنو! انفس جمع قلت ہے جو جمع متکلم کی طرف مضاف ہے اور جمع جب جمع کی طرف مضاف ہوتی ہے تو تقسیم احاد کی مقتضی ہوتی ہے مثلاً "رکب القوم دوابھم" اس کے یہ معنی نہیں کہ جملہ اشخاص سب گھوڑوں پر چڑھ گئے بلکہ ہر ہر شخص اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ہوا اور یہ قاعدہ متعارف و متداول ہے اور کتب نحو میں بہ تصریح مذکور۔

یہ سن کر وہ خاموش ہو گیا اور کوئی جواب اس سے بن نہ پڑا۔ کہنے لگا میرے پاس ایک دلیل اور بھی ہے میں نے کہا کہ اُسے بھی پیش کیجئے۔

ملا باشی: آیت انما ولیکم اللہ و رسولہ کی تفسیر میں جملہ اہل تفسیر کا اتفاق ہے کہ حضرت علیؓ کے متعلق نازل ہوئی ہے اور آیت میں انما کلمۂ حصر ہے جس سے ان کا افضل امت ہونا ظاہر ہوتا ہے۔

میں: اس دلیل کے متعدد جوابات ہیں۔

میں اسی قدر کہنے پایا تھا کہ اس کے ساتھیوں میں سے ایک نے فارسی زبان میں کہا کہ یہ بحث چھوڑ دو کیونکہ یہ شخص تمہاری ہر دلیل کو توڑتا چلا جائے گا اور لوگوں کی نگاہوں میں تم اسی قدر گرتے جاؤ گے یہ سن کر اس نے میری طرف دیکھا اور مسکرا کر کہا کہ آپ فاضل شخص ہیں میری ہر دلیل کا جواب دے سکتے ہیں لیکن میرا روئے سخن تو دراصل بحر العلم کی طرف تھا۔ میں نے کہا کہ آغاز سخن میں آپ نے فرمایا تھا کہ فحول علماء اہل سنت بھی میری دلیلوں کا جواب نہیں دے سکتے اس بنا پر میں نے گفتگو کی ورنہ مجھے کوئی بحث نہ تھی۔

ملا باشی: میں عجمی شخص ہوں۔ عربی بولنے میں کبھی کبھی مقصود کے خلاف بھی الفاظ میری زبان سے نکل جاتے ہیں۔

میں: اچھا اب میں دو سوال کرتا ہوں جس کی بابت مجھ کو یقین ہے کہ علماء شیعہ میں سے کوئی بھی ان کے جواب نہ دے سکے گا۔

ملا باشی: وہ کیا ہیں؟

میں: کیا تمہارے یہاں یہ روایت مسلم نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد تمام صحابہ (بوجہ حضرت علیؓ کی خلافت پر بیعت نہ کرنے کے) مرتد ہو گئے۔ بجز پانچ کے حضرت علیؓ، مقداد، ابوذر، سلمان فارسی، اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہم۔

ملا باشی: ہاں مسلم ہے۔

میں: اگر معاملہ یہ تھا تو پھر کیوں حضرت علیؓ نے اپنی بیٹی ام کلثوم کا نکاح حضرت عمرؓ کے ساتھ کیا؟

ملا باشی: مجبوراً دیا ہوگا۔

میں: بخدا تم نے حضرت علیؓ کی ایسی منقبت پر عقیدہ رکھا ہے جس کو ادنیٰ عرب بلکہ اجلاف بازاری بھی اپنے لئے جائز نہ رکھیں گے۔ اگر جبراً کسی کی بیٹی کو کوئی بیاہ لے تو کیا اس کی زندگی بے غیرتی کی زندگی نہیں ہے؟ پھر تم کیسے دعوے

کر سکتے ہو کہ حضرت علیؓ اسداللہ، شیر خدا، شاہ مرداں اور شجاع دوراں تھے۔

ملا باشی: یہ بھی احتمال ہو سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے یہاں بجائے ام کلثومؓ کے کوئی چڑیل یا بھتنی رخصت کی گئی ہو۔

میں: یہ جواب اس سے بھی عجیب تر ہے اگر اس احتمال کا دروازہ کھولا جائے تو شریعت کا کوئی نقطہ اپنی جگہ پر باقی نہیں رہ سکتا۔ مثلاً ایک شخص اپنی منکوحہ کے پاس جاتا ہے وہ کہتی ہے کہ ممکن ہے کہ تم میرے شوہر نہ ہو بلکہ جن یا بھوت ہو۔ اگر وہ دو گواہ پیش کرے تو وہ کہہ سکتی ہے کہ ممکن ہے کہ یہ انسان نہ ہوں بلکہ غول بیابانی ہوں۔ علیٰ ہذا ایک قاتل عدالت میں پیش کیا جائے وہ بیان کرے کہ میں نے قتل نہیں کیا ممکن ہے کہ کوئی جن میرا ہمشکل بن گیا ہو۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ مذہب جعفری جس کو تم حق سمجھتے ہو ممکن ہے کہ امام جعفرؒ سے نہ مروی ہو بلکہ کسی جن سے ہو جس نے ان کی شکل اختیار کر لی ہو۔ الغرض وہ اب کے بھی ساکت ہوا اور ایک حرف آگے نہ چل سکا۔ اب میں نے دوسرا سوال پیش کیا اور پوچھا کہ ظالم خلیفہ کے افعال کی بابت تمہارا کیا عقیدہ ہے؟

ملا باشی: غیر نافذ ہیں شرعاً اور دیانتاً۔

میں: یہ بتلائیے کہ حضرت علیؓ کے بیٹے محمد بن الحنفیہ کی والدہ کس قبیلے کی تھیں؟ اور کس نے ان کو مالِ غنیمت میں حاصل کیا تھا؟

ملا باشی: میں نہیں جانتا (میرے خیال میں اس نے صحیح نہیں کہا کیونکہ ممکن نہیں کہ وہ اس بات کو نہ جانتا ہو) لیکن علمائے شیعہ میں سے ایک نے کہا کہ وہ بنی حنیفہ میں سے تھیں اور حضرت ابوبکر کے عہد میں ان کے حکم سے بنی حنیفہ کے ساتھ جو لڑائی ہوئی تھی اس میں گرفتار ہو کر قیدیوں کے ساتھ آئی تھیں۔

میں: پھر حضرت علیؓ نے یہ کیسے جائز سمجھا کہ خلیفۂ ظالم کے مالِ غنیمت میں سے کنیز لے کر اس سے اولاد پیدا کریں۔ اس معاملہ میں تو نہایت احتیاط کی ضرورت تھی۔

ملا باشی: ہو سکتا ہے کہ حضرت علیؓ نے اس کو خود بنی حنیفہ سے بطور ہبہ کے مانگ لیا ہو۔

میں: اس کی کوئی دلیل؟

اس پر ہر طرف خاموشی تھی۔

میں: میں نے قصداً احتیاط رکھی کہ کوئی حدیث یا کوئی آیت آپ کے سامنے پیش نہ کروں اس لئے کہ ممکن ہے کہ ہم دونوں اس کی صحت یا اس کی تاویل میں متفق نہ ہوں، اور استدلال صرف انہی باتوں سے ہو سکتا ہے جو فریقین کے نزدیک مسلم ہوں۔ میرے یہ دونوں سوالات عقل و عرف کی بنا پر تھے۔

اس مناظرہ کی لفظ بہ لفظ صحیح صحیح خبریں شاہ تک پہنچ گئیں۔ اس نے حکم دیا کہ جملہ علماء باہم جمع ہو کر مکفرات کو اٹھا دیں اور ایک دوسرے کی تکفیر سے دست بردار ہو جائیں، اور میں ان کا حکم رہوں۔ اس لئے ہم سب ملا باشی کے خیمے سے نکل کر اس مجمع طرف چلے جو ضریح علیؓ کے متصل اس غرض کے لئے جمع ہوا تھا۔

علماءِ ایران کی تعداد ۷۰ تھی جن میں سے صرف ایک شخص مفتی اردلان سنی تھا اور باقی سب شیعہ۔ ان میں ممتاز حضرات کے نام میں نے اسی وقت لکھ لئے تھے۔

(۱) ملا باشی علی اکبر (۲) مفتی رکاب آقا حسین (۳) ملا محمد امام لاہجان (۴) آقا شریف مفتی مشہد رضا (۵) مرزا برہان قاضی شروان (۶) شیخ حسن مفتی اردمیہ (۷) مرزا ابوالفضل مفتی قم (۸) حاجی صادق مفتی جام (۹) سید محمد مہدی امام اصفہان (۱۰) حاجی محمد زکی کرمان شاہ (۱۱) حاجی محمد ثمامی مفتی شیراز (۱۲) مرزا اسد اللہ مفتی تبریز (۱۳) ملا طالب مفتی مازندران (۱۴) ملا محمد مہدی نائب صدر مشہد۔ (۱۵) ملا محمد صادق مفتی خلخال (۱۶) محمد مومن مفتی استر آباد (۱۷) سید محمد تقی مفتی قزوین (۱۸) ملا محمد حسین مفتی سبزوار (۱۹) سید بہاء الدین مفتی کرمان (۲۰) سید احمد مفتی اردلان شافعی۔

افغانستان کے علماء جو سب کے سب حنفی تھے حسب ذیل تھے:

(۱) شیخ فاضل ملا حمزہ قلنجانی مفتی افغانستان (۲) ملا امین قلنجانی قاضی افغانستان (۳) ملا ویناخلقی۔ (۴) ملا طہ افغانی مدرس مدرسہ نادر آباد۔ (۵) ملا محمد قلنجانی (۶) ملا عبدالرزاق قلنجانی (۷) ملا ادریس ابدالی۔

تھوڑے عرصہ کے بعد علماءِ ترکستان آئے جن کی تعداد سات تھی۔ ان کے آگے ایک شیخ تھا جس کے چہرے سے رعب اور وقار گزرتا تھا ایک بڑا عمامہ سر پر۔ دیکھنے والے کو خیال گذرتا تھا کہ امام اعظمؒ کے شاگرد رشید امام یوسف چلے آرہے ہیں۔ ایرانیوں نے اس خیال سے کہ میں ان سے کوئی بات نہ کرسکوں، مجھ سے پندرہ آدمیوں کے فاصلے پر بائیں طرف ان کو بٹھایا۔ اسی طرح افغانی علماء کو بھی دائیں طرف مجھ سے دور جگہ دی۔ ترکستانی علماء کے نام یہ ہیں۔

(۱) علامہ ہادی خواجہ بحر العلم قاضی بخارا حنفی (۲) میر عبداللہ صدور بخارا حنفی (۳) قلندر خواجہ بخاری حنفی (۴) ملا امید صدور بخاری حنفی (۵) بادشاہ میر خواجہ بخاری حنفی (۶) مرزا خواجہ بخاری حنفی (۷) ابراہیم بخاری حنفی۔

جب مجلس بیٹھ چکی ملا باشی نے بحر العلم کو مخاطب کیا اور کہا آپ اس شخص (میری طرف اشارہ کرکے) کو پہچانتے ہیں۔ بحر العلم نے کہا کہ نہیں۔ ملا باشی نے کہا کہ یہ فضلاء اہل سنت میں سے ہیں شیخ عبداللہ آفندی۔ ان کو احمد پاشا والی بغداد نے شاہ کے حسب طلب بھیجا ہے تاکہ اس مجلس میں ہمارے نگراں اور شاہد رہیں۔ شاہ نے ان کو اپنا وکیل بنا دیا ہے۔ جن پر ہمارا اتفاق ہوتا جائے گا یہ شاہد رہیں گے۔ لہٰذا آپ ان تمام امور کو بیان کریں جن کی بنا پر ہم شیعوں کی تکفیر کرتے ہیں تاکہ اگر واقعی وہ موجب کفر ہوں تو ہم ان سے باز آجائیں ورنہ حقیقت میں تو ہم کافر نہیں ہیں خود امام ابوحنیفہ کے نزدیک بھی۔ چنانچہ جامع الاصول میں ہے کہ اسلام کے پانچ مذاہب ہیں جن میں سے ایک مذہب جعفری بھی ہے۔ اسی طرح صاحب مواقف نے بھی امامیہ کو اسلام کا ایک فرقہ تسلیم کیا ہے اور امام ابوحنیفہؒ کا قول فقہ اکبر میں ہے کہ ہم اہل قبلہ کو کافر نہیں سمجھتے۔ شرح ہدایہ میں یہ تصریح موجود ہے کہ صحیح یہ ہے کہ امامیہ اسلام ہی کا ایک فرقہ ہے لیکن باوجود متقدمین کی ان تصریحات کے بھی متاخرین نے غلو اور تعصب سے کام لیکر ہم کو کافر بنانا شروع کیا جس طرح ہمارے فرقہ کے لوگوں نے آخر میں سنیوں کی تکفیر شروع کردی۔ حالانکہ نہ ہم کافر ہیں نہ تم۔ بہرصورت ہمارے اندر کفر کی

جو باتیں آپ کے خیال میں ہوں ان کو ظاہر کیجئے۔

بحرالعلم: سب شیخین۔

ملا باشی: ہم نے اس کو چھوڑا۔

بحرالعلم: تم صحابہ کرامؓ کو کفار، مرتد اور گمراہ کہتے ہو۔

ملا باشی: سارے صحابہ عدول ہیں۔ رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ

بحرالعلم: متعہ کو حلال سمجھتے ہو۔

ملا باشی: متعہ حرام ہے جو اس کی حلت کا قائل ہو وہ سفیہ ہے۔

بحرالعلم: تم علیؓ کو ابوبکرؓ پر فضیلت دیتے ہو اور کہتے ہو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد وہی خلیفۂ برحق تھے۔

ملا باشی: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس امت میں سب سے افضل ابوبکرؓ، پھر عمرؓ، پھر عثمانؓ، پھر علی رضی اللہ عنہم ہیں اور اُن کی خلافتیں بھی اسی ترتیب کے ساتھ ہیں۔

بحرالعلم: تمہارا اصول اور عقیدہ کیا ہے؟

ملا باشی: ہم ابوالحسن اشعری کے عقیدہ پر ہیں۔

بحرالعلم: شرط یہ ہے کہ شرع کی کسی چیز کو حرام یا حرام کو حلال نہ بناؤ۔

ملا باشی: یہ شرط منظور ہے۔

بحرالعلم نے اس کے بعد کچھ اور شرطیں بھی پیش کیں جن کو کفر سے علاقہ نہ تھا۔ ملا باشی نے ان سب کو قبول کیا پھر کہا کہ جب ان سب امور کے ہم پابند ہو گئے تو اب تم کو ہمارے مسلمان شمار کرنے میں کیا عذر ہے؟

بحرالعلم: شیخین پر تبرا کفر ہے۔

ملا باشی: ہم نے اس کو چھوڑا۔

بحرالعلم: (کچھ دیر تک سکوت کے بعد) لیکن شیخین کو برا کہنا تو کفر ہے۔

ملا باشی: جناب ہم نے تو اس کو چھوڑ دیا پھر بھی آپ ہم کو کفار ہی کہتے رہیں گے۔

بحرالعلم: بہرصورت سب شیخین تو کفر ہے۔

مراد بحرالعلم کی یہ تھی کہ سب شیخین چونکہ کفر[1] ہے اور جس سے کفر صادر ہو مذہب حنفی کے مطابق اس کی توبہ قبول نہیں۔ پھر میں کیسے تسلیم کر لوں کہ شیعہ مسلمان ہیں جب کہ یہ کفر اُن سے سرزد ہو چکا ہے۔

---

[1] لیکن حقیقت یہ ہے کہ نہ سب شیخین کفر ہونا قابل توبہ۔ یہ فتاوے جن لوگوں نے دیئے ہیں ان کے حالات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خاص خاص اسباب سے وہ شیعوں سے ذاتی تعصب اور عداوت رکھتے تھے۔ (اسلم)

آخر مفتی افغان ملا حمزہ نے کہا کہ ہادی خواجہ! کیا تمہارے پاس کوئی ثبوت موجود ہے کہ ان سے سب شیخین کا کفر صادر ہوا ہے جو تم ان کی توبہ قبول نہیں کرتے۔ بحر العلم نے کہا کہ نہیں۔ ملا حمزہ نے کہا کہ جب وہ حتمی وعدہ کرتے ہیں کہ ہم تبرا نہ کہیں گے تو پھر اس کے قبول کر لینے میں کونسی شے مانع ہے۔ اس پر بحر العلم نے کہا کہ اچھا یہ لوگ بھی مسلمان ہیں جو ہمارے حقوق وہ ان کے حقوق۔

جب یہ بات طے ہو گئی تو شیعہ، حنفی اور شافعی تینوں فرقوں کے علماء امراء اور اعیان کھڑے ہو گئے ہم مصافحہ اور معانقہ کرنے لگے اور ایک دوسرے سے بچھڑے ہوئے بھائیوں کی طرح بغل گیر ہونے لگے۔

اس وقت ہمارے پس پشت اردگرد عجمی امراء اور تماشائیوں کا ہجوم دس ہزار سے کم نہ تھا جو سب کے سب جوش سرور اور فرط مسرت سے آپس میں ایک دوسرے کو مبارکباد دے رہے تھے۔

یہ مجلس بحسن وخوبی چہارشنبہ کے دن مغرب سے پہلے ختم ہو گئی۔ رات کو دس بجے شاہ کی طرف سے ایک آدمی آیا جس نے کہا کہ شہنشاہ آپ کو سلام کہتے ہیں اور آپ کی مساعی کے شکر گذار ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ کل کی مجلس میں جب آج کی باتوں کا عہد و پیمان ہوگا اور ہر فریق محضر پر دستخط کرے گا آپ بطور شاہد اور میرے وکیل کے موجود رہیں گے اور محضر کی پیشانی پر خود اپنے قلم سے اپنی شہادت تحریر کریں گے اور مہر لگائیں گے۔

میں نے کہا کہ بسر و چشم میں اس حکم کی تعمیل کروں گا۔

دوسرے دن یعنی پنجشنبہ ۲۵ شوال کو ضریح علیؓ کے سامنے دوپہر سے پہلے اجتماع ہوا۔ ہم سب لوگ وہاں پہنچے حاضرین کی تعداد کم سے کم ساٹھ ہزار تھی۔ محضر نامہ سات بالشت کے کاغذ پر فارسی زبان میں لکھا گیا تھا۔ ملا باشی نے مفتی رکاب آقا حسین کو جو بلند آواز شخص تھا اس کے سنانے کا حکم دیا اس نے مجمع عام میں پڑھا۔ اس کا مضمون یہ تھا:۔

اللہ جل شانہٗ اس دنیا میں سلسلہ وار رسول بھیجتا رہا۔ سب کے آخر میں محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس نے اپنا رسول بنا کر بھیجا جن پر رسالت ختم کر دی۔ ان کی وفات کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بالاتفاق ابوبکر صدیقؓ ابن ابی قحافہؓ کو ان کا جانشین بنایا اور ان کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کی۔ حضرت علیؓ نے بھی بطیب خاطر بلا جبر و اکراہ بیعت فرمائی۔ اور باجماع صحابہ وہ امت کے امیر اور خلیفہ ہو گئے۔ پھر انھوں نے بذریعہ عہد کے عمر بن خطابؓ کو اپنا جانشین کیا۔ ان کے ہاتھ پر بھی جملہ اصحاب نے مع حضرت علیؓ کے خوشی کے ساتھ بیعت کی۔ عمرؓ نے خلافت کو اپنے بعد چھ امیدواروں میں بطور شوریٰ کے چھوڑ دیا جن میں سے ایک علی بن ابی طالبؓ بھی تھے۔ کثرت رائے سے حضرت عثمانؓ خلیفہ ہو گئے۔ جب وہ اپنے گھر میں باغیوں کے ہاتھ سے شہادت پا گئے اور امت بلا خلیفہ کے رہ گئی اس وقت صحابہؓ نے حضرت علیؓ کو خلیفہ بنایا اور ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔

یہ چاروں خلیفہ ایک زمانے میں تھے، ان میں کبھی باہم کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔ بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ محبت رکھتا تھا اور اس کی تعریف کرتا تھا۔ یہاں تک کہ جب علیؓ سے شیخین کی بابت سوال کیا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ وہ

دونوں امام عادل اور برحق تھے اور اسی پر مرے۔ اسی طرح جب حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر لوگ بیعت کرنے لگے تو انھوں نے فرمایا کہ تم میں علیؓ موجود ہیں پھر بھی تم میرے ہاتھ پر بیعت کرتے ہو۔

اہل ایران تم کو یقین رکھنا چاہئے کہ ان کی افضلیت اور خلافت اسی ترتیب پر ہے جس طرح بیان کیگئی سو جو شخص ان کی تحقیر یا ان کی بابت کوئی ناشائستہ کلمہ زبان سے نکالے گا اس کا مال، اولاد اور خون سب شہنشاہ کیلئے حلال ہوگا اور اس کے اوپر اللہ، ملائکہ اور جملہ بنی نوع انسان کی لعنت ہوگی۔

میں نے صحرائے مغاں میں تخت نشینی کے وقت یہی عہد لیا تھا۔ اب جو کوئی صحابہؓ کو برا یا شیخین پر تبرا کہے گا اس کو اس کے اہل وعیال سمیت قید کروں گا اور مال وجائداد ضبط کرلوں گا۔ یہ بدعت ایران میں کبھی نہیں تھی۔ اس کا ظہور اسماعیل شاہ صفوی کے عہد ۹۰۷ھ سے ہوا جو اب تمام ملک میں پھیلی ہوئی ہے۔

یہ حصہ شاہ کی طرف سے تھا۔ اس کے نیچے چند سطریں تھیں جن میں باشندگان ایران کی طرف سے عہد تھا کہ:

ہم صحابہؓ کو برا نہ کہیں گے اور تبرے سے دستبردار ہوئے۔ خلفائے اربعہ کی فضیلت اور خلافت کے ہم اسی ترتیب کے ساتھ قائل ہیں جو اس محضر میں مندرج ہے جو اس کے خلاف کرے اس پر اللہ کی، فرشتوں کی اور سارے آدمیوں کی لعنت ہو اور شہنشاہ کے لئے اس کا مال، عیال اور خون حلال ہے۔

اس کے نیچے علماء اور عمائد ایران کے دستخط ہوئے اور ان کی مہریں لگائی گئیں۔ پھر اس کے بعد یہی مضمون چند سطروں میں کربلا، نجف، حلہ اور خوارزم کے باشندوں کی طرف سے تھا اس پر ان کی مہریں ثبت ہوئیں۔ مہر لگانے والوں میں سید نصر اللہ بن قطہ اور شیخ جواد نجفی وغیرہ ممتاز افراد تھے۔

پھر اس کے تحت میں چند سطریں علمائے افغانستان کی طرف سے تھیں کہ ایرانی جب ان باتوں کی پابندی کرینگے جو اس محضر میں ہیں تو ہم ان کو کافر نہیں سمجھیں گے بلکہ ان کو اپنے بھائی مسلمانوں کا ایک فرقہ تسلیم کریں گے اس کے نیچے ان کے دستخط ہوئے اور ان کی مہریں لگائی گئیں۔

بعینہٖ یہی مضمون ترکستانی علماء کی طرف سے بھی تھا۔ انھوں نے بھی اس پر مہریں لگائیں۔ عنوان پر میں نے اپنی شہادت لکھ کر دستخط کیا اور مہر لگائی۔

جب یہ تمام کارروائی ختم ہوگئی تو مجمع سے ایک خوشی کا نعرہ بلند ہوا۔ سنی اور شیعہ سب کے سب فرحناک تھے اور نہایت گرم جوشی سے باہم گلے مل رہے تھے۔ اس کے بعد شاہ کی طرف سے چاندی کی سینیوں میں خدام حلوے اور مٹھائیاں لئے ہوئے آئے اور خالص سونے کے جڑاؤ عطر دانوں سے جو مشک وعنبر سے بھرے ہوئے تھے مجمع کی خاطر کی گئی۔

پھر شاہ نے مجھ کو بلایا اور کہا کہ میں آپ کا اور ساتھ ہی احمد خاں (پاشا) کا شکر گزار ہوں کہ مسلمانوں کو باہمی تکفیر اور خونریزی سے بچانے میں سعی فرمائی۔ میں از راہِ شکر نہ کہ از راہِ فخر یہ کہتا ہوں کہ اس کام کو اللہ نے میرے ہاتھ سے کرایا کہ صحابہ کرامؓ پر

تبرا کرنے سے لوگ تائب ہوئے ورنہ سلاطین عثمانیہ نے کس قدر خونریز جنگیں کیں اور بارہا لشکر لے کر چڑھائی اور لڑائی کرتے رہے مگر یہ سعادت ان کے حصہ میں نہ تھی اور میں نے بلا ایک قطرۂ خون بہائے شاہانِ صفویہ کی اس بدعت قبیح پر جو سارے ملک پر چھائی ہوئی تھی فتح حاصل کر لی۔

میں نے کہا کہ انشاء اللہ سارا ایران جیسے پہلے سُنّی تھا اب پھر ہو جائے گا۔ شاہ نے کہا رفتہ رفتہ۔ اس کے بعد سر اٹھا کر بولا کہ میں اگر فخر کروں تو کہہ سکتا ہوں کہ میری ذات اس وقت مجموعہ ہے چار عظیم الشان سلاطین کا یعنی ہندوستان افغانستان، توران، اور ایران۔ کیونکہ ان چاروں ممالک کی زمام حکومت میرے ہاتھ میں ہے لیکن رفع تبرا کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ تائید الٰہی سے یہ امر حاصل ہوا ہے اور چونکہ میں ذریعہ ہوں، اس لئے تمام عالم اسلامی کی یہ خدمت مجھ سے ہوئی ہے مجھے امید ہے کہ صحابۂ کرامؓ میرے اس فعل سے خوش ہوں گے اور آخرت میں میری شفاعت کریں گے۔

اس کے بعد مجھ سے کہا کہ تم ابھی ٹھہر جاؤ۔ کل جمعہ ہے اور میں نے حکم دیا ہے کہ جامع کوفہ میں جمعہ پڑھا جائے اور منبر پر حسب ترتیب خلفاء کا نام لیا جائے آخر خلیفہ عثمانی کے لئے دعا کی جائے اس کے بعد میرے لئے کیوں کہ میں ان کو اپنا بڑا اور بزرگ بھائی سمجھتا ہوں۔ ان کے باپ دادا پشتہا پشت سے اسلام کی خدمت کرتے چلے آئے ہیں اور تم جانتے ہو کہ میں جب دنیا میں آیا تو میرا باپ سلطان نہ تھا۔

میں دربار سے واپس آیا دیکھا کہ ہر ہر خیمہ میں ایرانی بیٹھے ہوئے اسی میثاق کا تذکرہ کر رہے ہیں اور اصحاب ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے فضائل آیات واحادیث سے نکالتے اور شاہانِ صفویہ کی اس رسم تبرا پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں۔

دوسرے دن اعتماد الدولہ ظہر کے وقت مجھے لینے کے لئے آیا کہ چل کر جمعہ میں شرکت کروں میں نے کہا کہ جامع کوفہ میں حنفیہ کے نزدیک بھی جمعہ نہیں ہو سکتا کیونکہ آبادی نہیں ہے اور شافعیہ کے نزدیک بھی کیونکہ باشندوں کی تعداد چالیس تک نہیں پہنچتی۔ اس نے کہا کہ آپ جمعہ نہ پڑھیں وہاں تو صرف آپ کی موجودگی درکار ہے۔ چنانچہ میں گیا۔ جماعت میں امراء خوانین۔ علما اور عوام تقریباً پانچ ہزار تھے۔ منبر پر شاہی امام تھا اس نے خطبہ میں خلفاء کا حسب ترتیب نام لیا اور ان کی مدح کی۔ پھر خلیفہ عثمانی اس کے بعد نادر شاہ کے لئے دعا مانگی اور امامیہ کے قاعدہ کے مطابق نماز پڑھائی۔ شام کے وقت شاہ نے مجھے واپسی کی اجازت دی اور میں بغداد کو روانہ ہو گیا۔

صاحب جہاں کشائے نادری نے لکھا ہے کہ نادر شاہ نے مرزا محمد علی نائب وزیر کو روانہ کیا کہ وہ تمام ایران میں دورہ کر کے خطبوں میں خلفائے اربعہ کا نام داخل کریں اور سارے ملک میں اس محضر کی اشاعت کر کے تعمیل کرائیں۔

بابِ عالی میں بھی یہ عسکری کیفیت لکھ کر درخواست کی کہ اب خلیفہ کو اس کے پانچوں مطالبات منظور کر لینے چاہئیں۔
ایک مدت تک سفیروں کی آمد و رفت ہوتی رہی مگر ترکی کے شیخ الاسلام اور سلطان محمود نے اس کی دو باتوں سے انکار کر دیا یعنی نہ مذہب جعفری کی صحت تسلیم کی نہ کعبہ میں پانچواں مصلّٰی منظور کیا۔ باقی تین مطالبات تسلیم کر لئے۔
نادر شاہ بھی مصلحتِ وقت دیکھ کر ان دو امور کے مطالبہ سے دست بردار ہو گیا۔ بالآخر محرم ۱۱۶۰ھ میں فریقین میں عہد مصالحت لکھا گیا جس پر سلطان کی طرف سے لطیف آفندی عثمانی سفیر نے دستخط کئے۔

یہ پرچہ
آپ کے پاس پہنچے گا تو
رعایتی میعاد
دو ماہ سے بھی کم رہ گئی ہو گی
لہٰذا
اگر آپ نے اب تک
معارف القرآن
کی مجلدات کا آرڈر نہیں دیا تو جلدی کیجئے
۳۱ر دسمبر کے بعد یہ رعایت ختم ہو جائیگی
معراجِ انسانیت (معارف القرآن جلد چہارم)
رعایتی قیمت: بارہ روپے (علاوہ محصولڈاک)
تاریخِ رسالت (معارف القرآن جلد سوم)
رعایتی قیمت: دس روپے (علاوہ محصولڈاک)
ادارہ طلوعِ اسلام۔ رابسن روڈ کراچی

عالمِ اسلام

(محترم عبدالرحمٰن صدیقی صاحب)

عبدالرحمٰن صدیقی صاحب کا نام نامی محتاج تعارف نہیں۔ آپ مشہور اہل قلم ہیں اور عالم اسلامی کے حالات و کوائف میں گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ انھوں نے کئی بار ممالک اسلامیہ کا دورہ کیا ہے اور وہاں کے حالات کا قریب سے مطالعہ کیا ہے۔ ان کا خصوصی میدان ممالک اسلامیہ ہیں اور ان سے متعلق ان کا ذخیرہ معلومات بہت وسیع ہے۔ جس ژرف نگاہی سے صدیقی صاحب نے دنیائے اسلام کو دیکھا ہے، عہد حاضر میں شاید ہی کسی اور صاحب کو یہ توفیق حاصل ہوئی ہو۔ کم از کم مسلمانوں میں اس گہری اور وسیع نظر کا جواب نہیں ملیگا۔ یہی نہیں کہ آپ کی معلومات وسیع ہیں بلکہ ان کا انداز نگاہ انہی سے مختص ہے اور یہ ان کا طرہ امتیاز ہے کہ جو کچھ وہ دیکھتے ہیں وہ بے خوف ہو کر کہہ گزرتے ہیں۔ مداہنت اور تملق سے آپ کو دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اسی نقص نے دربار، حلقوں میں جہاں خوشامد اور چاپلوسی کا چلن ہے باریاب نہیں ہونے دیا۔

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش — میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

یہی وجہ ہے کہ یہ جوہر ملت کے کام نہیں آسکا اور اس ایک پر کیا موقوف ہے اس بدبخت ملت نے کس جوہر کو پہچانا ہے!

صدیقی صاحب اکثر انگریزی زبان میں لکھتے ہیں۔ یہ مضمون انھوں نے اردو میں لکھا اور مجلہ "تاریخ و سیاست" کراچی کی جولائی ۱۹۵۱ء کی اشاعت میں شائع ہوا۔ طلوع اسلام دیگر جرائد سے مضامین نقل کرنے کا عادی نہیں اور ہمیشہ اس سے اجتناب برتا گیا ہے۔ لیکن مضمون کی افادیت کے پیش نظر ہم اپنی عادت توڑنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ مجلہ "تاریخ و سیاست" کے شکریہ کے ساتھ ہم یہ مضمون اپنے ہاں شائع کر رہے ہیں۔ طلوع اسلام

موجودہ زمانے کی رفتار پر قلم اٹھانا آسان نہیں۔ سنہ ۱۹۳۹ - ۱۹۴۵ء کی جنگ کے بعد روز بروز معاملات اور حالات جس تیزی سے بدل رہے ہیں اور دنیا کو کہاں سے کہاں لئے جا رہے ہیں اس کا صحیح اندازہ کرنا مشکل ہی نہیں، محال معلوم ہوتا ہے مغربی اقوام نے اپنی زندگی کا معیار اقتصادی اصول پر قائم کیا ہے۔ دنیا کے پس ماندہ حصوں سے خام مال لانا، اس سے اپنے کارخانوں میں چیزیں تیار کرانا اور پھر انھیں بیچنے کے لئے بازار فراہم کر کے اپنی قوم کے لئے زائد سے زائد دولت جمع کر کے اسے

راحت و آرام پہنچانا، یہ ان کا نظریہ ایک عرصہ دراز سے چلا آرہا ہے۔ کولمبس اور واسکوڈے گاما نے نئے بحری راستے ڈھونڈھ نکالے۔ اس سے قبل مشرق اور مغرب میں ایک توازن سا تھا۔ چند چیزیں مشرق میں بھی بنتی تھیں جن کا تبادلہ بحر وسطیٰ کے آسیائی کنارے اور مصر کے تاجر اطالیہ کی شہری حکومتوں کے تجار یعنی وینس، فلارنس وغیرہ سے کیا کرتے تھے۔ سولہویں صدی کے وسط تک یہ تجارت اس زمانے کی دنیا پر چھائی ہوئی تھی۔ امریکہ اور ہندوستان اور مشرق قریب اور بعید کے بحری راستے کھل جانے کے بعد یہ تجارت مغربی یورپ کی اقوام کے ہاتھ چلی گئی اور بجائے اطالوی قوم کے اب ہسپانوی، پرتگالی، انگریزی، فرانسادی اور ولندیزی قومیں نظر آنے لگیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عرب جو اس تجارت میں برابر کے شریک تھے آہستہ آہستہ دھندلے ہوتے گئے، تا آنکہ اس میں سے غائب ہو گئے۔

مسلمانانِ عالم کی سیاسی، اقتصادی اور سب سے بڑھ کر دماغی اور علمی تباہی اور زوال کی کئی وجوہ بیان کی گئی ہیں۔ یہ کہا گیا ہے کہ اصلی سرچشمہ اسلام پر جب ایک طرف ایرانی، دوسری طرف بازنطینی اثر پڑا اور عرب اور عجم کا فرق مٹا گیا تو جیسا کہ تاریخ میں پایا جاتا ہے فاتح دماغی حیثیت سے مفتوح ہو گیا۔ اپنی بنیادی خوبیاں بھول گیا۔ عیش و آرام پسند کر لیا اور اپنے باپ دادا کی دولت کھو بیٹھا۔ یہی اثر علوم اسلام پر ہوا۔ غایت کو بھول کر فروغات پر وقت خراب ہونے لگا۔ جمعیت اسلام پر علمی حیثیت سے جمود طاری ہو گیا اور کش مکش عالم میں مسلمان پسپا ہوتے چلے گئے۔ وہ لوگ جنھوں نے ارسطو اور فلاطون کے نام قائم رکھے اور علم کے ہر پہلو میں اضافے کئے اور صدیوں تہذیب اور تمدن کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھایا خود اپنے عالموں کی جہالت سے بجائے آگے بڑھنے کے ترقی معکوس کرنے لگے۔ اور زندگی کے ہر پہلو میں زوال، تباہی، بربادی اور جہل کے آثار دکھلانے لگے۔ زوال ترقی کرتا گیا اور مسلمان برائے نام مسلمان رہ گئے اور پرانی لکیروں کے فقیر بننے کو مایۂ فخر و امتیاز سمجھا۔

علاوہ ازیں یورپ والوں کو ایک نیا ذریعہ اپنی ترقی اور طاقت کو اور آگے بڑھانے کا ہاتھ آگیا، وہ بھاپ تھی۔ کارخانوں میں جہاں دس دس چیزیں بنتی تھیں اب سینکڑوں اور ہزاروں بننے لگیں۔ بحری اور بری سفر اور سیاحت جن میں ہفتوں اور مہینے لگتے تھے اب گھنٹوں اور دنوں میں طے ہونے لگے۔ دنیا چھوٹی ہو گئی اور یورپ والے اس پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک قابض ہو گئے۔ مسلمان اور دیگر آسیائی ممالک انھیں دیوتا سمجھنے لگے اور ان کے آگے سر تسلیم خم کر دیئے یا یہ کہئے کہ نیند میں سو رہے تھے، جب آنکھ کھلی تو دیکھا کہ اگر پورے نہیں تو نیم غلام ضرور بن گئے۔

انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں عالم اسلام میں کئی مسلم حکومتیں موجود تھیں لیکن سب کی سب کمزور اور پراگندہ حال تھیں، یورپ والوں نے جہاں اپنی تجارت کو آگے بڑھایا وہاں یہ بھی دیکھا کہ مسلم اقوام میں پہلے کی سی شان، ہمت اور بہادری باقی نہیں رہی جن سے صدیوں خوف زدہ اور ڈرتے رہے تھے، وہی فرنگی اب دلیری سے ان کی تخریب اور تباہی پر تل گئے۔ نہ صرف تجارت بلکہ جنگہائے صلیبی کی دیرینہ دشمنی کو بھی ان عیسوی اقوام نے دوبارہ تازہ کیا اور اس کے ذریعے سے اپنے اندرونی اور بیرونی سیاسی مسئلوں کو بھی سلجھانے کی کوشش کی۔ اندرونی جھگڑوں کو مٹانے میں زیادہ کامیابی نہیں ہوئی لیکن عالم اسلام

کی بیخ کنی کرنے میں سب متحدہ اور مل کر متواتر کوشش کرتے رہے اور کامیاب ہوئے۔ پرانی صلیبی تحریک کو نئی صورت میں پیش کرنے کے تین طریقے اختیار کئے گئے۔ سب سے پہلے عیسائی حکومتوں کا اتحاد قائم ہوا اس کا نام (Concert of Europe) رکھا گیا۔ ساتھ ساتھ خاندان اقوام یعنی (Family of Nations) کی تحریک پر زور دیا گیا اور اس کے زیر اثر مسئلہ مشرق Eastern Question پر متفقہ کوشش شروع ہوئی کہ غیر عیسوی حکومتوں کو یورپ سے نکال دیا جائے۔ ان عیسائی حکومتوں کے اندرونی جھگڑے قائم رہے لیکن عالم اسلام کی دشمنی میں سب برابر کے شریک تھے۔ بنیاد اس کی ویسٹ فالیا کے صلح نامے میں رکھی گئی اور پھر یکے بعد دیگرے وی اے نا، برلین اور پیرس کے صلح ناموں میں اس کی عمارت کھڑی کی گئی۔ یورپ کے مشہور اور معروف سیاسی زعما جیسے کہ مے ترنکھ، بس مارک اور روسی بادشاہ اور اس کے وزراء نے اس اسلام دشمنی میں پورا حصہ لیا۔ بہانے کے لئے عثمانی حکومت کی عیسائی رعایا پر ظالم اور بے رحم ترک کی بے رحمیوں کے جھوٹے قصے گھڑے اور انھیں پادریوں کے ذریعے سے ورغلا کر حکومت کے خلاف سازشیں اور بلوے کرنے پر آمادہ کیا اور ان کی روپے، ہتھیار اور ہر ممکن طریقے سے مدد کی۔

اٹھارویں صدی تک دو بڑی یعنی عثمانی اور تیموری اور دیگر چھوٹی چھوٹی مسلم حکومتیں بحر اطلانتک سے لیکر بحر اوقیانوس تک موجود تھیں، گو سب کی سب کمزور تھیں اور اپنی حفاظت کے ناقابل۔ یکے بعد دیگرے ان کی تباہی اور بربادی ہسپانیہ، پرتگال، ولندیز، انگریز اور فرانس کے ہاتھوں بحری راستوں سے اور روس کے ہاتھوں زمین کے راستے سے کی گئی۔ نام کے لئے جنھیں رہنے دیا گیا وہ سسکتی رہیں اور ایک دن گم ہو گئیں۔ اس زوال کی پوری تاریخ ایک مختصر مضمون میں لکھنی مشکل ہے۔ صرف ایک سرسری نگاہ ہی ڈالی جا سکتی ہے۔ تاکہ جو کچھ ہوا اس پر غور کر کے آئندہ کیلئے اگر پرانی عظمت کے دوبارہ حاصل کرنے کی کوئی راہ نہ نظر آئے تو کم از کم جو کچھ تھوڑا بہت بچا کھچا رہ گیا ہے اس کے سنبھالنے اور اس کی حفاظت کے طریقے اختیار کئے جائیں کیا عجب ہے کہ اس میں نہ صرف مسلمانان عالم کی نجات مضمر ہو بلکہ بنی نوع انسان کو ہر بیس پچیس سال کی جنگ سے بچا کر صلح اور امن کے راستے پر ڈالا جائے۔ جو لوگ اپنے آپ کو مہذب اور متمدن کہنے لگے ہیں اور ہر موقع پر امن کے شہزادے حضرت عیسیٰ کا نام لیتے ہیں انھوں نے تو چنگیز خاں اور ہلاکو خاں کو بھی شرمندہ کر دیا ہے۔ یہ لوگ وہ ہیں جنھوں نے جنگ سپاہیوں سے لیکر تمام قوم پر پھیلا دی ہے۔ عورت اور مرد، بوڑھے اور بچے، سپاہی اور غیر سپاہی کا فرق مٹا کر عام تباہی اور بربادی کو معیار جنگ تصور کر لیا ہے اور روزانہ نئے نئے تباہ کن آلات ایجاد کر کے زائد سے زائد افراد کو مارنے اور ان کے رہنے سہنے، کھانے پینے کے ذرائع کو برباد کرنے کے درپے ہیں۔ جو قوم ایٹم بم جیسے ستیاناس کرنے والے آلے کا استعمال جائز سمجھتی ہے، تہذیب یافتہ سمجھنا تو درکنار اسے انسانیت سے خارج کر دینا چاہیئے۔

اگر کرۂ ارض پر نگاہ ڈالی جائے تو عیاں ہے کہ اس کے شمالی اور جنوبی حصوں کے درمیان مراکش سے لیکر چین کی حدود تک ایک پٹی چلی گئی ہے جس میں مسلم اقوام آباد ہیں۔ اگر اس حصے کی آبادیاں اور ان کی حکومتیں اپنی بہبود اور برتری کی کوشش کریں، تعلیم اور صنعت و حرفت اور مدافعت کی طرف توجہ کریں تو ناممکن نہیں ہے کہ یورپ جس میں اب امریکہ کو شامل کرنا

لازمی ہو گیا ہے) کی خونخوار اور وحشی اقوام کو ان کے استعماری سامان اور سپاہیوں کے برتنے پر جنگ کرنے سے روک سکیں اور جو کام "مجلس اقوام" یا نام نہاد جمعیت الامم متحدہ (یو۔این۔او) نہیں کر سکی ہیں وہ کر سکیں۔ کامیابی کی امید اس وجہ سے کی جا سکتی ہے کہ مسلمانوں میں کالے گورے کا فرق نہیں ہوگا۔ جاتی دھرم اور نسل کے خیالات نہیں ہوں گے اور نہ کارخانے نہ تجارت کے اصول ایسے ہوں گے کہ خریدار کو بھیک منگا اور فقیر کر کے صرف اپنے ملک اور اس کے باشندوں کے آرام و آسائش کا ایک ہی خیال ان کے دماغوں میں بھرا ہوگا۔ مسلمانانِ عالم کو ان کے اصلی فرائض کی طرف متوجہ کرنا اور اسلام کی اصلی غایت کی طرف پھیرنے جانا آسان نہیں۔ دین کے ٹھیکیدار جو اپنے آپ کو علمائے کرام کہتے ہیں اور پادری اور پروہت بن گئے ہیں انھوں نے دنیا کے ہر حصے میں مسلمان کو نہ صرف جاہل رکھا بلکہ اسے گمراہ کیا اور صراطِ مستقیم سے دور کر کے اس کے دل سے اسلام کی اصلی خوبیاں نکال کر اس میں پیری مریدی اور قبر پرستی بھر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تعویذ گنڈے اس کی حکمت ہو گئے۔ اوراد و وظائف اس کی جہد و عمل بن گئے۔ علمی، اخلاقی اور روحانی حیثیت سے وہ روز بروز اعلیٰ سے ادنیٰ ہوتا گیا اور دنیا کے ہر حصے میں جو کچھ اس کے ہاتھ میں تھا وہ کھو بیٹھا، کفار کی غلامی کا تاج اپنے سر پر رکھ لیا اور اس پر فخر کرنے لگا۔ وہ اقوام جو اس کے درباروں میں آ کر سر نیچا کر کے عرضداشتیں پیش کیا کرتی تھیں، وہی اس کی آقا بن بیٹھیں۔

انیسویں صدی عیسوی میں زوال کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی۔ روس جیسی جاہل اور غیر متمدن قوم ادرال کے پہاڑوں کو عبور کر کے نہ صرف سمرقند، بخارا، خیوا اور کاشغر پر قابض ہو گئی بلکہ چنگیز اور ہلاکو کے وطن پر قبضہ کر کے بحرِ اوقیانوس کے ساحل تک پہنچ گئی۔ انگریز اور فرانس نے پرتگالی، ہسپانوی اور دیگر مغربی اقوام کو ہندوستان سے نکالا پھر ان دونوں میں جنگ ہوئی۔ فرانس کو بھی آخر کار ہندوستان چھوڑنا پڑا۔ لال قلعہ کا آخری مغل تاج دار رنگون میں گمنامی میں مرا۔ خاندان عثمان کے سلاطین سلیم یادوز اور سلیمان اعظم کے گیت گاتے رہے۔ جس قوم کا سمندری بیڑا یورپ کا سب سے طاقتور بیڑا تھا اور خیر الدین اور طغرل ایسے مشہور امرا البحر تھے جن کے نام سے دنیا کانپتی تھی وہ بیڑا ان کے بعد ناوارینو کی بحری لڑائی میں تباہ کیا گیا اور اس کے بعد یورپ کے بیڑوں میں جہاں اس کا درجہ اول تھا، آخری ہو گیا۔

ترکی سپاہی جو صدیوں تک یورپ میں اسلام کی پشت و پناہ بنا رہا وہ وی انا کے دوسرے محاصرے میں شکست کھانے کے بعد پھر آگے نہ بڑھ سکا۔ اس حادثے کے بعد عیسائی حکومتوں نے متحدہ طور پر ایک طویل جنگ صلیبی شروع کی۔ آج رومانیا کل روملیا اور پرسوں صربستان ترکوں کے ہاتھ سے نکل گئے۔ ایک طرف روس تو دوسری طرف فرانس نے ترکی کی عیسائی رعایا کی سرپرستی کے دعوے کئے اور استنبول کی حکومت کو قبول کرنے پڑے۔ اس کے بعد بالقان میں جتنی جنگیں ہوئیں اور قفقاز اور کرم میں ترکی حکومت کو یکے بعد دیگرے اپنی سلطنت کے حصوں سے دست بردار ہونا پڑا۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ترکی کی تباہی میں اسلام کی دشمنی اور مسلمانوں کی بربادی کا عیسائی قوموں نے تہیہ کر لیا تھا۔ ورنہ انگلستان کا وزیر اسکوتھ جس کی حکومت ترکی سے دوستی کے اعلانات کرتی رہی آخری جنگ بلقان میں جب رومیوں نے سلانیک فتح کیا انھیں یہ مبارکباد نہ دیتا کہ جس بندرگاہ سے سینٹ پال

عیسائیت نے کر یورپ میں داخل ہوا تھا وہ دوبارہ عیسائیوں کے زیر اثر آگئی اور اسلام پسپا کیا گیا!

ترکی کا نام یورپ والوں نے اب مریض یورپ رکھا اور اس کے ستانے اور اسے مٹانے پر کمر باندھ لی۔ اس میں بدقسمتی سے چند خائن مسلمان امراء نے ان کا ہاتھ بٹایا۔ عبدالکریم پاشا نے بلقان میں، تو المقری نے مراکش میں اور محمد علی نے مصر میں سلطان کو اور زیادہ کمزور کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ شیخ عبدالقادر الجزائری۔ شیخ شامل داغستانی اور کچھ عرصے کے بعد عرابی پاشا مصر اور السید احمد السنوسی طرابلس الغرب میں ضرور پیدا ہوئے لیکن اخلاقی اور مادی کمزوریاں اتنی بڑھ گئی تھیں کہ آخر کار ہتھیار ڈال دینے پڑے اور باقیماندہ زندگی قید یا ہجرت میں گذار دی۔

اس تباہی کا دوسرا باب انگریز اور فرانس کی مصر میں رقابت سے شروع ہوتا ہے۔ فرانسیسی مہندس ڈے لیسپس کی نہر سویز کی تجویز مصر کے لئے مہلک ثابت ہوئی۔ سعید پاشا والی مصر کو دھوکا دے کر اس مہندس نے لاکھوں پونڈ لوٹے کیونکہ یہ تجویز نہ تو فرانس والوں نے قبول کی اور نہ لندن والوں نے۔ سعید کے انتقال کے بعد اسماعیل پاشا جو مصر کا پہلا خدیو بنایا گیا اسے بھی بری طرح سے لوٹا۔ نہر کی کھدائی بیگار سے ہوئی، نہ کھانا پورا دیا جاتا تھا اور نہ پینے کو پانی ملتا تھا۔ ہزاروں بلکہ لاکھوں مزدور موت کے گھاٹ اتر گئے۔ اگر نہر سویز کے دونوں کناروں کو کھودا جائے تو ان مسکینوں کی ہڈیوں کے پہاڑ بن جائیں گے۔ انگلستان کے وزیر بنجامن ڈزرائیلی نے جو بعد میں ارل بے کنس فیلڈ کے نام سے مشہور ہوا جب اس تجویز کی اہمیت محسوس کی اور ساتھ ساتھ اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ خدیو اسمٰعیل بیحد و حساب مقروض ہو گیا ہے تو اس نے خدیو کی نہر سویز کی کمپنی کے حصے خرید لئے گو کمپنی کا مرکزی ادارہ فرانس ہی میں رہا مگر اب انگلستان کا بول اس کی کارروائیوں میں بالا ہو گیا۔ مصر والوں کے آنسو پوچھنے کی کوشش کی گئی لیکن انگلستان نے جبرالٹر، مالٹا، نہر سویز اور عدن پر اپنا تسلط جما لیا اور ہندوستان کا راستہ اپنے لئے صاف کر لیا۔ اس کے بعد مصر میں فرانس کا اثر کم ہو گیا اور انگریز نے نہایت چالاکی سے سمجھوتہ کر لیا کہ اگر فرانس مصر سے چلا جائے تو مراکش، الجزائر اور طونس میں برطانیہ دخل نہ دے گا اور فرانس وہاں جو چاہے پوری آزادی سے کر سکتا ہے۔ اس طرح انگریز مصر پر حکمراں ہو گئے اور فرانس شمالی افریقہ پر۔ یہ اکثر حصے ترکی سلطنت کے تھے جو ان لوگوں نے چھین لئے اور ترکی انھیں بچا نہ سکا۔ ایک مدت کے بعد جب اطالیہ نے کچھ زور پکڑا تو فرانس اور انگلستان نے جو اپنے آپ کو ترکی کا دوست ظاہر کرتے تھے اطالیہ کی خفیہ طور پر مدد کی اور اسے طرابلس الغرب دلا دیا۔

۱۹۱۴-۱۸ء کی جنگ نے ترکی سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔ عربوں نے اور تقریباً دنیا کے سب مسلمانوں نے اس میں حصہ لیا۔ یوں تو اپنے آپ کو خلیفہ اور خلافت کے دلدادہ ظاہر کرتے رہے لیکن خلیفہ کے عساکر کی قتل و غارت گری میں کوئی کمی اٹھا نہ رکھی اور خلیفہ کے ملک کا بڑا حصہ اس سے چھین کر غیر اسلامی حکومتوں کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ ہندی مسلم تو انگریز کا غلام تھا ہی لیکن حجاز، سوریا اور عراق کے عربوں نے اپنے بادشاہ سے بغاوت کی اور اپنے پڑوسی مسلمان بھائیوں کو غیروں کے در غلانے پر ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں شہید کیا۔ عرب یہ سمجھے تھے کہ ترک کے ہٹ جانے سے ہم آزاد ہو جائیں گے اور اپنی حکومت شریف حسین کے زیر اثر قائم کریں گے۔ مجھ سے عرب ممالک کے ایک بڑے مشہور قائد نے کہا تھا کہ فرانس میں ہماری جو خفیہ جماعتیں کام کر رہی تھیں ان کی

نیت یہ تھی کہ نمسہ (آسٹریا) اور مجارستان (ہنگری) کی طرح ترکی حکومت کے دو حصے کر دیں۔ ترکی کا بادشاہ ہمارا بھی سلطان اور خلیفہ رہے، اور اس میں ایک مصلحت ہماری یہ تھی کہ چونکہ عرب سپاہی ترک سپاہی کی طرح بہادر نہیں ہے ترکی عساکر ہماری مدافعت بھی کریں گے۔ انگریز نے خاص طور پر اور فرانس نے اس خیال کو چلنے نہ دیا۔ ان دونوں نے حسین کو ملک اور خلیفہ بنایا اور عرب ان دونوں حکومتوں کا غلام بن گیا۔ حسین کے بعد اس کے تین بیٹوں کو انگریزوں نے بادشاہ بنایا۔ جب حسین کو مکہ سے نکال کر جزیرہ قبرس میں قید کیا تو علی، حجاز میں بادشاہ بنایا گیا۔ فیصل جو انگریزوں کی آنکھ کا تارا بن گیا تھا اسے اول دمشق میں گدی پر بٹھایا لیکن جب فرانس نے اسے بادشاہ قبول کرنے سے انکار کیا بغداد لے گئے۔ طالب پاشا نقیب جس نے جنگ میں انگریز کا ساتھ دیا تھا اور جس سے عراق کی بادشاہت کا وعدہ کیا گیا تھا، اسے انگریزی حاکم نے چائے پر بلایا۔ اس کی بیوی نے اسے کیک بسکٹ کھلائے اور اسے موٹر پر سوار کر کے انگریزی لڑائی کے جہاز پر سوار کر کے جزیرۂ سیلان روانہ کر دیا۔ مند حکومت کی بجائے قید فرنگ نصیب ہوئی۔ فیصل عراق کا بادشاہ مقرر ہوا۔ اب اس کا پوتا وہاں کا بادشاہ ہے اور علی جسے عبدالعزیز ابن سعود نے انگریزوں کی مدد سے مکے سے نکالا تھا اسی حسین کا بیٹا عبداللہ اس فیصل دوم کا ولی مقرر کیا گیا ہے۔ حسین کا ایک لڑکا جس نے بغاوت کے سلسلے میں اپنے باپ کی طرف سے پہلی گفتگو کچھ سے مصر میں کی تھی باقی رہ گیا تھا، اسے کہاں بھیجتے۔ حسین کے اصرار پر اور انگریزی عسکری ماہرین کی رائے پر اس کے لئے فلسطین کے مشرق میں اور حجاز کے شمالی میں شرق الاردن کا نام دے کر ایک ریاست قائم کی گئی۔ شروع میں عبداللہ امیر کہلایا لیکن انگریز کی وفاداری کے طفیل میں اب ملک کہلاتا ہے۔ گو حکومت کی باگ انگریزی لشکر کے ضابطۂ اعلیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ غرض شریف حسین جو اپنے آپ کو ملک العرب کہنے لگا تھا وہ تو قبرس میں دیوانہ وار زندگی بسر کر کے مر گیا اور اس کا خواب دو حصوں میں منقسم ہو کر بغداد اور عمان میں ابھی تک باقی، واقعی نظر آتا ہے۔

سنہ ۳۹-۱۹۴۵ء کی جنگ کے بعد عالم اسلام میں دو نئی حکومتوں کا ظہور ہوا۔ ایک پاکستان اور دوسری انڈونیشیا۔ امید بندھتی ہے کہ اگر انہیں ستایا نہ گیا اور ان کی سیاسی اور اقتصادی ترقی میں امریکہ، انگلستان، فرانس اور ولندیزوں نے رکاوٹیں پیدا نہ کیں تو شاید متحد ہو کر یہ دیگر مسلم حکومتوں کی کچھ مدد کر سکیں۔ اس امداد میں تاخیر ضرور ہوگی کیونکہ خود ان کی کامل آزادی میں ابھی وقت لگے گا۔ پاکستان کے لئے ایک طرف افغانستان اور دوسری طرف ہندوستان کی غیر ذمہ دارانہ حرکات پریشان کن ہیں۔ آمدنی کا بڑا حصہ اسے اپنی حفاظت اور مدافعت پر خرچ کرنا پڑتا ہے اور اسی حد تک صنعت و حرفت، تعلیم، صحت عامہ کی ترقی میں کمی پڑتی ہے۔ انڈونیشیا والے بھی مغربی اقوام کی ملی بھگت اور عیاری کا شکار بنے ہوئے ہیں۔ انگریز ہند چینی میں فرانس کی مدد کر رہا ہے۔ فرانس ملایا میں انگریز کی۔ اور یہ دونوں جاوا، سماٹرا اور بورنیو میں ولندیزوں کا ساتھ دے رہے ہیں۔ حالانکہ یہ بھگوڑے جاپانیوں کی صورت دیکھ کر دم دبا کر بھاگے تھے۔ جمہوریت کے نام سے خدا کی مخلوق کو یہ فرنگی اپنے ذاتی تجارتی اور اقتصادی اغراض کے حصول کے لئے اشتراکی کا نام دے کر چھوٹی اور بڑی جنگوں میں مبتلا کرتے ہیں اور اپنی زبردست جنگی طاقت سے نئی شکل میں استعماریت کے دور کو دوبارہ طول دے رہے ہیں۔ وجہ اس کی یہ کہ اگر دنیا کا دو تہائی حصہ اشیائے خام نہ پیدا کرے اور مغربی کارخانوں کو زندہ نہ رکھے

تو باقی ماندہ ایک تہائی گوری چمڑی والا حصہ اپنی ثروت اور بلندی قائم نہیں رکھ سکتا۔

روس کے خوف کے مارے ترکی بیچارہ امریکہ کا سپاہی بن گیا ہے۔ حکومت موجود ہے اور مجلس ملی بھی لیکن ضروری امور میں امریکہ کی تعمیل کرنی پڑتی ہے۔ انگریز اور امریکی عربوں سے دوستی کے دعوے بھی کرتے ہیں اور یہودیوں کو ان کی بربادی کا آلہ بھی بنا رکھا ہے۔ مصر میں نہر سویز کا مسئلہ اور انگریزی افواج اور اثر کو وہاں سے اور سوڈان سے خارج کرنے کا سوال وہاں کی حکومت کو ملک کی فلاح کی تدبیروں کی طرف حسب ضرورت توجہ کرنے ہی نہیں دیتے۔ شرق الاردن میں حکومت عبداللہ کی ہے لیکن حکم انگریز کا نافذ ہے۔ فلسطین کے دو حصے کئے گئے۔ ایک شرق الاردن کو دیا گیا جس میں آدھے قدس شریف کے شہر کے سوا باقی یا تو ریگستان ہے یا کوہستان۔ لبنان میں عیسائیوں کو مسلمانوں کے برابر تعداد میں کر دیا اور وہ اس طرح سے کہ جو عیسائی وہاں سے شمالی اور جنوبی امریکہ ہجرت کر گئے تھے اور جن کی دو دو اور تین تین پشتیں آباد ہو گئی تھیں، جو نہ عربی جانتے تھے اور نہ جن کا ارادہ لبنان آنے کا تھا نہ ہے، انھیں لبنانی شمار کیا اور اس طرح مردم شماری میں ان کی تعداد بڑھائی گئی۔ سوریا نے فرانس کے خلاف دو مرتبہ جنگ بھی کی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ دوسری جنگ عظیم میں جب فرانس کی مرکزی حکومت المانیوں کے قبضے میں آ گئی تو انگریزوں نے موقع پاکر ویشی کی حکومت کے نمائندوں کو وہاں سے نکالا۔ سوریا کی مکمل آزادی کا اعلان کیا گیا۔ فرق صرف اتنا ہوا کہ بجائے فرانسوی آقا کے اب انگریز آقا ہو گئے۔ جب شامی عمائدین سے کہا گیا کہ مجاہدین فلسطین کی مدد کرو اور اسرائیلیوں کو پسپا کرو تو جواب دیا کہ چونکہ انگریز یہودیوں کے دوست ہیں اور انگریزوں کی مدد سے ہمیں آزادی ملی ہم ان کے مشورے اور مصلحت کے خلاف کوئی ایسی بات نہیں کرنی چاہتے جس سے حکومت انگلیسی ناراض ہو۔ اس ذہنیت کا ایک نیا شاخسانہ یہ پھوٹا کہ عربوں کو ہمیشہ کے لئے اپنے زیر اثر لانے کے لئے اور یہودیوں کی حکومت کی حدود زیادہ سے زیادہ آگے بڑھانے کے لئے ہلال خضیب کی تحریک شروع کی۔ سوریا۔ عراق اور شرق الاردن کو ملا کر ایک حکومت قائم کرنا اور یہودیوں کو سینا میں بحر میت سے لیکر مصر کی سرحد تک ایک مثلث دے کر انھیں عقبہ تک پہنچانا اور نہر سویز کے جواب میں غزہ سے عقبہ تک ایک نئی نہر کھود کر زک دینا اور ایشیائی مسلمانوں کو افریقہ کے مسلمانوں سے الگ کرنا، یہ اس تحریک کے مقاصد تھے۔ یہودی تو کامیاب ہوئے لیکن دمشق کے دو عسکری بلوؤں نے عبداللہ اور بغداد میں جو انگریزی گرگے تھے انھیں خوف زدہ کر دیا۔ ہلال خضیب کی تحریک ملتوی کی گئی۔ لیکن موقع اور محل پاکر انگریز اسے کسی نہ کسی دن دوبارہ اٹھائیں گے اور کیا عجب ہے کہ عربوں کی کمزوری ملوکی ذہنیت سے فائدہ اٹھا کر اور روسی بھوت سے انھیں ڈرا کر کامیاب ہو جائیں۔ جانیہ کا انگریزی ہوائی اور لشکری مستقر اور دیگر امریکی انگریزی طیارہ گاہیں پاکستان کی حدود سے لیکر بحر وسطیٰ کے ساحل تک تمام ملکوں کو ڈرانے اور ستانے کے لئے کافی ہیں۔ روس کا نام لے کر جمہوریت کے گیت گانے کا ایک ہی مطلب ہے جو ایک لفظ میں ادا ہوتا ہے۔ وہ لفظ "تیل" ہے۔ اسی تیل کے لئے اور اسے طرابلس الشام اور حیفہ تک نلوں میں لے جانے کے لئے عراق، شرق الاردن، سوریا، لبنان اور فلسطین کی آزادی کی قیمت ان کی نگاہوں میں لوزی کے برابر بھی نہیں ہے۔ ایران کا قضیہ چل رہا ہے۔ نوری سعید انگریزوں کے معتمد ہیں۔

جب ضرورت پیش آتی ہے عراق کے وزیر اعظم بنا دیئے جاتے ہیں۔ آج کل نوری پاشا کے ہاتھ میں عراق کی حکومت کی تیل میں ڈوبی ہوئی باگ ڈور پھر سے سپرد کی گئی ہے۔ کویت اور بحرین کے شیوخ پرانے ہندی راجا مہاراجوں سے بھی گئے گذرے ہیں۔ جو انگریز کہے گا اسے آمنا وصدقنا کہہ کر قبول کرلیں گے۔ سلطان عبدالعزیز ابن سعود سلطان نجد، ملک الحجاز وملحقاتہا نے الحسیٰ میں تیل نکالنے کا ٹھیکہ امریکہ کو دیا ہے۔ اس پر دلالی کا نفع کروڑوں روپے سالانہ کا ملتا ہے۔ یہ بھی افواہ ہے کہ بحر احمر کے حجازی ساحل پر نہ صرف تیل کے ملنے کی امید ہے بلکہ وادی فاطمہ جو مکے اور مدینے کے درمیان واقع ہوئی ہے اس میں سونا اور دیگر معدن ملے ہیں اور امریکی ماہرین اور تاجروں کو یہ قدرتی دفینے نکالنے اور فروخت کرنے کے حقوق بخشے گئے ہیں۔ ایک مرتبہ یہ اقتصادی حقوق ملنے کے بعد مغربی طاقت رفتہ رفتہ اپنے اقتصادی مفاد کے تحفظ کے لئے ان ملکوں کی سیاست اور آزادی پر بھی ہاتھ ڈالے گی اور انھیں ناکارہ اور بے حس کرنا چاہے گی۔ یمن میں سنا جاتا ہے کہ معدنیات بہت ہیں لیکن ابھی تک تو وہاں کا نیا بادشاہ اپنے دارالسلطنت بھی نہیں جا سکا ہے۔ انگریز کے گماشتوں نے وہاں بھی خانہ جنگی شروع کرادی ہے۔ مصلحت یہ معلوم ہوتی ہے کہ اگر یمن میں اقتصادی اور حرفتی کام کوئی کرے تو انگریز ہی کریں۔ یہ کام کسی دوسری قوم کے ہاتھ میں نہ جائے یمن ترقی کرے یا نہ کرے۔

ان کے علاوہ دیگر نام نہاد مسلم حکومتیں یا ملتیں خواہ وہ سائبیریا میں ہوں یا شمالی افریقہ میں قابل رحم و ہمدردی ہیں۔ تعجب ہوتا ہے کہ ملک عبداللہ کی حالت دیکھتے ہوئے بھی السید السنوسی کے خاندان کا ایک شخص سید احمد، جو طرابلس الغرب کی بست سالہ جنگ میں برابر اطالیہ سے لڑتے رہے اب وہ انگریز کی سرپرستی اور حمایت کے تحت وہاں کا بادشاہ بنا ہے۔ اس کے ذریعے سے انگریز ایک طرف مصر کو ستائے گا اور دوسری طرف فرانس، طونس، الجزائر اور مراکش کے مسکینوں کو ہر طرح برباد کریگا۔

آج کل اتحاد اسلام، کل مومنین اخوۃ دینی اور شرعی حکومتوں کے قیام کے نعرے سنائی دیتے ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ اخوۃ اور مساوات اصلی معنوں میں کہیں نظر نہیں آتی۔ غضب تو یہ ہے کہ سوریا اور ترکی کے سوا ہر مسلم ملت نے بادشاہت کو قبول کیا ہے۔ ان بادشاہوں کے ساتھ ان کے امرا اور پاشا ہیں، جو ہر لحظہ اور ہر گھڑی اپنے مانڈے پر حلوہ کھینچنے کی تاک میں رہتے ہیں۔ یہ حضرات مغربی حکومتوں کی جاسوسی کو فخر سمجھتے ہیں۔ اپنی رعایا اور فلاحین کے لئے ایک دمڑی تک خرچ نہیں کرتے۔ ان کے بچوں کی تعلیم کا کوئی انتظام ہے نہ ان کے علاج معالجے کا۔ نہ انھیں پوری خوراک ملتی ہے اور نہ رہنے کو ٹھکانے کا گھر۔ پاشا حضرات گرمیوں میں یورپ اور سردیوں میں اپنے اپنے وطنوں میں رہتے ہیں۔ مصر وحدت النیل کے دعوے کر رہا ہے۔ انگریز سوڈان لے بھاگا اس کی ایک بڑی وجہ یہ کہ مصری افسران سوڈان اور نوبیا جانے سے انکار کرتے ہیں۔ کیونکہ وہاں گرمی زیادہ ہوتی ہے اور وہاں کے باشندوں کو یہ لوگ بربر کہتے ہیں۔ اگر کسی کو بیوقوف۔ جاہل، نالائق کہنا ہو تو مصری اسے بربر کہتے ہیں۔ برخلاف اس کے انگریز جو ایک سرد ملک سے آتا ہے سوڈان کی گرمی میں رہتا ہے، اپنی قوم کی خدمت کرتا ہے اور مصر کی سیاسی تحریک کے قدم جمنے نہیں دیتا۔

ہندوستان کی خلافت کی تحریک سے انگریز بہت پریشان ہوا تھا۔ لائڈ جارج نے کوشش کی تھی کہ نیم مردہ ترکی کو آسٹریلیا،

کناڈا، نیوزی لینڈ کی افواج کے زور سے پہلی عالمگیر جنگ کے بعد صفحۂ ہستی سے مٹا دے۔ اس کی تجویز نہ چل سکی۔ اس وجہ سے کہ یہ لوگ ترکی سپاہی کی بہادری اور دلیری دیکھ چکے تھے، گو پٹ گیا تھا تاہم اپنے وطن اور ناموس کے لئے آخری مرتبہ لڑنے اور فنا ہونے کے لئے تیار تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کرزن جو انگلستان کا وزیر خارجہ تھا اسے صلح نامہ سیور (Sevres) کو پھاڑ ڈالنا پڑا اور لوزان میں نئے صلح نامے پر دستخط کرنے پڑے۔ میثاق ملی جو انقرہ کی بڑی مجلس نے قبول کیا تھا وہ دنیا کو قبول کرنا پڑا اور ترک اناطول میں ترک بن کر اپنی نئی زندگی بسر کرنے لگا۔ انگریز نے اور فرانس نے ترکی کے عربی حصوں کو اس سے الگ کر دیا۔ عراق، فلسطین، شرق الاردن اور حجاز انگریز کے حصے میں آئے اور لبنان اور سوریا فرانس کے۔ اگر شریف حسین واقعی طور پر ملک العرب بنایا جاتا تو ناممکن نہ تھا کہ ایک معقول اور متحدہ عربی حکومت قائم ہو جائے اور صورت حالات وہ نہ ہوتی جو ہوئی۔ فرانس اور انگلستان نے مشرق ادنیٰ اور مشرق وسطیٰ کے ٹکڑے کر دیئے۔ چھوٹی چھوٹی حکومتیں قائم کیں اور ان میں عناد و دشمنی کا بیج بو دیا۔ یہودی کو بطور ایک خنجر کے عربی دنیا کے جگر میں بھونک دیا اور قدس شریف کو ان کے ہاتھ سے چھین کر ایک بین الاقوامی شہر بنا دیا۔ عرب دیکھتے ہی رہ گئے۔ کرتے تو کیا کرتے۔ نہ فوج تھی نہ آلات جنگ اور نہ جنگ کرنے کی ہمت و دلیری۔ فرنگی شاطروں نے شریفی اور سعودی خاندانوں کی باہمی دشمنی کو ابھارا اور عرب ممالک کے حصے بخرے کر ڈالے۔ کچھ تو بنیادی خیالات کا اثر، کچھ ترکوں سے دشمنی کا۔ عرب جسے اخوت و مساوات کا سبق پڑھایا گیا تھا، اب تک عرب اور عجم کا فرق نہیں بھولا ہے۔ اس کا نعرہ العرب والعربیہ ہے۔ اس جاہلی خیال کو یورپ کے قومیت کے نظریے نے اور تقویت دی۔ المصر للمصریوں اور العراق للعراقیوں کی تحریک ایک واقعہ ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہی تخیل ترکی، ایران اور افغانستان میں پھیل گیا ہے۔ تاریخ عالم میں یہ پایا گیا ہے کہ جو اقوام تہذیب اور تمدن کے لحاظ سے آگے بڑھ گئی ہوں اور جن کے پاس مال و دولت اور عسکری طاقت اور اسلحہ زیادہ ہوں کمزور اور پسماندہ اقوام ان کی نقل کرنا اور ان کے سمجھائے ہوئے راستے پر قدم اٹھانا اپنے لئے دنیا میں نجات کا باعث سمجھتی ہیں۔ اکثر اچھے خاصے مسلم حضرات کھلم کھلا شراب اس وجہ سے پیتے ہیں کہ ان کے خیال میں اگر وہ شراب نہ پئیں تو یورپ والے انھیں غیر متمدن اور غیر مہذب سمجھیں گے۔ یہی حال علمی، سیاسی اور اقتصادی چیزوں میں ہے۔ انگریز اور یہودی سے ترک موالات کیا ہے لیکن سینکڑوں عرب ان لوگوں کی آڑھت سے اگر پہلے سو میں سے پچاس فی صد نفع پیدا کرتے تھے تو آج سو میں سے پانچسو پیدا کرتے ہیں۔ دور جانے کی کیا ضرورت ہے عربوں نے وہی کیا جو ہمارے مشرقی پاکستانی بھائیوں نے پٹ سن کی خرید و فروخت میں کلکتے کے مارواڑی تاجروں کے لئے کیا۔ تمام سیاسی تجویزیں دھری رہ گئیں اور لطیفہ یہ ہے کہ جو حضرات گلے پھاڑ پھاڑ کر چیختے تھے وہی سب سے بڑے ایجنٹ اور آڑتی ہوا کرتے تھے۔ اخلاقی تنزل اور خود غرضی کا نمونہ اس سے بڑھ کر اور کیا مل سکتا ہے۔

اوپر بیان ہوا ہے کہ عرب دنیا کی ممالک، عرب مملکتیں نہیں ہیں۔ اس میں تو متعدد شاہی خاندان، ان کے رشتے دار اور لشکری اور غیر لشکری وزراء اور افسروں کا راج ہے۔ ان لوگوں کو ان کے مغربی آقا خوب پہچانتے ہیں اور ان کے سرکاری دفتروں

میں اور کاغذات میں ہر ایک کی قیمت مندرج ہے۔ عوام کی حالت ایک سرے سے دوسرے سرے تک ناگفتہ بہ اور قابل رحم ہے۔ خیال تھا کہ عرب لیگ جس کی داغ بیل انگریزی نظامت خارجہ نے ڈالی اور جسے مصر کے وفدی وزیر اعظم مصطفیٰ پاشا النحاس نے اسکندریہ میں جامۂ عمل پہنایا، شاید آگے چل کر قوت حاصل کرے اور اپنے بل بوتے پر عربوں میں ناموس اور اپنی عزت کا جذبہ پیدا کرے۔ انگریزی نام تو عرب لیگ ہے لیکن عربی میں اس کا نام جامعہ دول العربیہ۔ اس کا اصلی راز اور مقصد زیادہ خوبی سے ادا کرتا ہے۔ شروع شروع میں تو اس جماعت نے پر کھولے اور سیاسی فضا میں اونچے اڑنے کی کوشش کی۔ لیکن جب لندن نے محسوس کیا کہ ان کا یہ پرند ضرورت سے زیادہ اونچا جا رہا ہے تو کبھی عمان، کبھی بغداد اور کبھی قاہرہ کی قینچیوں سے اس کے پر کاٹ دیئے گئے۔ سیاسی معاملات تو خیر۔ عرب لیگ اقتصادی، علمی، تہذیبی میدانوں میں بھی اتحاد قائم نہ کر سکی۔ گو زبان ایک، علم اور تہذیب ایک اور نسبت اور غایت ایک۔ عرب کے معنی عربی النسل کے نہیں ہیں اور نہ موجودہ لغت میں عرب کا مطلب مسلم ہے۔ عرب وہ ہے جو عربی زبان بولتا ہو خواہ وہ قبطی ہو، سوڈانی ہو یا مغرب الاقصا غیر عرب نسل کا ہو۔ عرب مسلم بھی ہو سکتا ہے، عیسائی بھی اور یہودی بھی۔ ایک خاصیت عرب میں اور بھی ہونی چاہئے اور وہ یہ کہ دنیا کی دیگر مسلم اقوام سے اپنے آپ کو برگزیدہ سمجھے اور لوگ اسے اسلامی دنیا کا برہمن تسلیم کریں! یہ ایک قابل غور مسئلہ ہے کہ آیا جامعہ الدول العربیہ عرب ملتوں کے دل سے یہ غیر اسلامی تباہ کن خیال نکال سکے گی یا نہیں، واللہ اعلم۔

ایک اور بڑی پھوٹ عالم اسلام میں پیدا کی گئی ہے اور اس میں مسلم حکومتیں خود مغربی حکومتوں کا ساتھ دے رہی ہیں۔ عرب لیگ نے تو متحدہ امم کی جماعت کے قانون کے تحت میں اور اس کے سہارے پر اپنے آپ کو اس کی ایک شاخ بنا لیا ہے۔ عرب لیگ عرب حکومتوں کی حد سے آگے قدم بڑھا نہیں سکتی لیکن دیگر اسلامی حکومتوں کو کیا ہو گیا ہے کہ انھوں نے بھی ایسے مسلمانوں کو جو غیر مسلم حکومتوں کی رعایا ہیں دائرہ اسلام سے خارج کر دیا ہے۔ ہندوستان، روس اور چین کے علاوہ دنیا میں بہت مسلم آباد ہیں انھیں بھول جانا اور ان سے تعلقات قطع کر دینا ظلم ہے۔ ممکن ہے دنیا کی موجودہ پریشانی اور دیوانگی کی حالت میں ان کی بے بسی اور پراگندگی انھیں موقع نہیں دیتی کہ وہ خود آگے بڑھیں لیکن یہی تو وقت ہے کہ ان سے ہمدردی کی جائے ان سے کہا جائے کہ گھبراؤ مت۔ تم ہمارے بھائی ہو اور ہم تمہیں برباد اور تباہ نہ ہونے دینگے۔ یوں تو اخباروں میں، اعلانات میں، تقاریر میں اور لاسلکی میں الاسلام والامۃ کا راگ سلامی مرکزوں سے بڑی شان سے الاپا جاتا ہے لیکن عملی نقطۂ نظر سے نتیجہ سود مند معلوم نہیں ہوتا۔ خدا خیر کرے۔

داستان بڑی اور رات چھوٹی ہے۔ عرب و عجم کا فرق دور کرنا چاہئے مغربی تخیل سے ہٹ کر اسلام کے سبق کو دوبارہ پڑھنا ہی نہیں بلکہ اس کے اصلی احکام اور اصولوں کو دنیا کی تقریباً چودہ سال کی ترقی کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ نئی تفسیروں اور نئے ارادوں کی ضرورت ہے صحیح معنوں میں تحاد اسلام قائم کرنا ہے۔ نہ صرف اسلامی حکومتوں کی خدمت کرنی ہے بلکہ انھیں مسلم ملتوں کی حکومتیں بنانا ہے۔ وقت درکار ہے لیکن اتنا نہیں کہ ہم مایوس ہو کر ہاتھ پر ہاتھ رکھکر بیٹھے رہیں۔ مغربی اقوام بنی نوع انسان کو گمراہ کر رہی ہیں۔ بیان کیا گیا ہے کہ جغرافیائی حیثیت سے عالم اسلام دنیا کے دو حصے کئے ہوئے ہے۔ دماغ اور ہمت کی ضرورت ہے، ناممکن نہیں ہے کہ رسول عربی کے نام لیوا تمام بین الامم اور بین الاقوام جماعتوں کو اسلام کے صراط مستقیم پر لے آئیں۔ اس راستے پر جس پر سیاہ اور سفید ایک دوسرے کو بھائی بھائی سمجھیں ایک دوسرے کی اخلاص اور محبت سے مدد کریں، مشرق اور مغرب کا فرق نکال دیں۔ اور انسان کو اصلی معنی میں پھر سے اشرف المخلوقات بنا دیں۔ وما ذالک علی اللہ بعزیز۔

حقائق وعبر

رویتِ ہلال مسلمانوں کی مرکزیت فنا ہوجانے کے بعد ان کی زندگی کس طرح انفرادیت میں بدل گئی اور اس سے ان میں کس قسم کا ذہنی اور عملی انتشار پیدا ہوگیا، اس کے مظاہرے، اس قوم کے ایک ایک فیصلے اور ایک ایک اقدام سے ہوتے رہتے ہیں۔ انہی میں ایک سوال چاند دیکھکر مختلف تقاریب (عیدین یا روزوں کی ابتداء) کے انعقاد کا ہے۔ اس مسئلہ (اور اس کے حل) نے کسقدر مضحکہ انگیز اور افسوسناک صورت اختیار کرلی ہے اس کا اندازہ ہر سال عید اور روزوں کے مواقع پر لگ سکتا ہے۔ بات بڑی آسان تھی۔ حکومت کے پاس رصدگاہیں (Observatories) موجود ہیں۔ ان رصدگاہوں کی اطلاعات پر بڑے بڑے اہم امور کے فیصلے ہوتے ہیں۔ چاند کے متعلق بھی اسی انداز سے فیصلہ کیا جاسکتا ہے اور پھر اس فیصلہ کو مرکزی حیثیت دیکر حکومت کی طرف سے نافذ کیا جاسکتا ہے۔ لیکن مولوی اُسے کس طرح گوارا کرسکتا ہے کہ "دین" کا معاملہ "دنیاداروں" کی تحویل میں چلا جائے۔ اُسے خطرہ ہے کہ اس طرح رفتہ رفتہ ان کے اقتدار کی ہر کنجی اربابِ حکومت کے ہاتھوں میں منتقل ہوجائے گی۔ ادھر حکومت بھی یہی چاہتی ہے کہ مولوی کو برہم نہ کیا جائے کیونکہ ابھی (اُن کے خیال میں) عوام پر مولوی کا کافی تسلط ہے۔ لہٰذا وہ بھی اس مسئلہ کے فیصلے کیلئے مولویوں کی طرف ہی رجوع کرتی ہے۔ اور، بقول اقبال

میں جانتا ہوں انجام اس کا جس معرکے کے مُلا ہوں غازی

نتیجہ یہ کہ ہر سال (بلکہ ہر تقریب پر) قوم عجیب الجھن میں پھنس جاتی ہے اور ان کی اس بوکھلاہٹ پر دنیا ہنستی ہے۔

بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ یہ ذہنیت جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، پرانی وضع کے ملاؤں کی ہے۔ نئے دور کے "علماء کرام" اس قسم کے نہیں ہیں۔ لیکن جدید و قدیم کی یہ تمیز محض ان کی خوش فہمی پر مبنی ہے۔ مُلا، مُلا ہی رہتا ہے خواہ وہ دورِ قدیم کا ہو یا عصرِ جدید کا۔ اصل چیز وہ قوت ہے جو اسے مذہب کے نام پر حاصل ہوتی ہے اور قوت کی ہوس ہر دور کے ملا میں اسی طرح موجود ہوتی ہے جس طرح پیشوائیت کی دمساز (Counter-Part) ملوکیت میں ہوتی ہے۔ اس کی شہادت کے لئے ذیل کا سوال اور جواب ملاحظہ فرمائیے جو اسلامی جماعت کے آرگن، ترجمان القرآن کی جولائی ۱۹۵۱ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے:

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین مندرجہ ذیل مسئلہ میں کہ رویت ہلال کے لئے ریڈیو کا اعلان شرعاً نافذ ہوسکتا ہے یا نہیں۔ صرف ریڈیو کے اعلان سے عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے احکام و نماز و ذبائح کرسکتے ہیں یا نہیں۔ قرآن اور حدیث سے اور استنباط ائمہ مجتہدین سے، دلل جواب تحریر فرمائیں۔

جواب: میری رائے میں اس مسئلے کے متعلق فرداً فرداً علما سے سوال کرنے کے بجائے حکومت پاکستان سے مطالبہ کرنا چاہئے کہ وہ ملک کے

مستند علماء کی ایک مجلس اس مسئلے کا تصفیہ کرنے کے لئے مقرر کرے اور وہ مجلس جو فیصلہ بھی کرے اسی پر ملک میں عمل کیا جائے۔
ہماری اپنی حکومت قائم ہو جانے کا کیا فائدہ ہے اگر ہمارے ہاں اس طرح کے مسائل کا تصفیہ کرنے کا بھی کوئی اجتماعی نظام نہ ہو سکے۔ اور ہر عید و بقر عید پر اختلاف کا ایک ہنگامہ برپا ہوتا رہے۔ علماء کی انفرادی آراء بہر حال اس باب میں مختلف رہیں گی اور ان سے فتوے لینے کا کوئی خاص فائدہ نہ ہوگا (ابوالاعلیٰ مودودی)

غور کیا آپ نے کہ حکومت سے کونسا مطالبہ کرنے کی تحریک کی جارہی ہے؟ یہ مطالبہ نہیں کہ حکومت ان معاملات کا خود فیصلہ کرکے اجتماعی نظام کی حیثیت سے اس فیصلہ کو نافذ کیا کرے تاکہ امت کے اختلافات رفع ہو سکیں۔ مطالبہ یہ ہو کہ حکومت "مستند علماء" کی ایک مجلس مقرر کرے اور جو فیصلہ وہ مجلس کرے، اس فیصلہ کو حکومت ملک میں نافذ کرے۔ فیصلہ علماء کا اور قوتِ نافذہ حکومت کی! یہ ہے "اسلامی حکومت" کا وہ تصور جو ان حضرات کے دل میں چٹکیاں لے رہا ہے! کوئی ہے جو ان سے پوچھے کہ "مستند علماء" کے پاس وہ کون سے خاص اسباب و ذرائع ہوں گے جن سے وہ فیصلہ فرمایا کریں گے کہ چاند نکلا ہے یا نہیں۔ یا جس سے وہ فتویٰ صادر فرمائیں گے کہ ریڈیو کی خبر قابلِ اعتماد مقرر کی جاسکتی ہے یا نہیں؟ کیا یہ ایسے امور نہیں جن کا فیصلہ علم عامہ اور عقلِ انسانی کی رو سے کیا جا سکے؟ لیکن مولوی کی برہمنیت نے تو قوم کو اس طرح اپنے شکنجے میں جکڑ رکھا ہے کہ وہ "استنجا پاک کرنے" کے طریقے کے لئے بھی علماء حضرات کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیتا ہے!

علماء حضرات کا اس باب میں کیا فتویٰ ہوگا وہ بھی اتفاق سے ہمارے سامنے ہے۔ علمائے فرنگی محل لکھنؤ کو طبقۂ علماء میں جو حیثیت حاصل ہے وہ کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ فرنگی محل کے مفتی مولانا عبدالقادر صاحب نے اس باب میں ایک فتویٰ صادر فرمایا ہے جس کے جستہ جستہ (متعلقہ) ٹکڑے حسب ذیل ہیں:

> ریڈیو سے نشر شدہ خبر ان طرق میں سے نہیں ہے جن کی بنا پر روزہ یا عیدالفطر وغیرہما کا حکم کرنا درست ہو۔ اس لئے کہ ریڈیو سے جو خبر نشر کی جاتی ہے وہ اناؤنسر یعنی خبر نشر کرنے والے کی پس پردہ آواز محض ہے اور آواز مفید علم و یقین نہیں ہوتی اسلئے کہ النغمۃ تشبہ النغمۃ والمشتبہ لایفید العلم (غایۃ شرح ہدایہ صفحہ ۴۶۲)

آپ نے دلیل ملاحظہ فرمائی؟ اس کے بعد ارشاد ہے کہ ریڈیو کی خبر شہادت (گواہی) کے حکم میں بھی نہیں آتی۔ اسلئے کہ

> شہادت کے واسطے شاہد کا مجلس حکم و مجلس قضا میں موجود ہونا شرط ہے۔ چنانچہ فتح القدیر میں ہے کہ . . . . لہذا ریڈیو کی خبر سن کر کسی عالم یا قاضی کو روزہ یا افطار کا حکم دینا درست نہیں۔

اس کے بعد تیسری دلیل ملاحظہ فرمائیے۔ ارشاد ہے:

> نیز ریڈیو سے دوسری خبروں کی طرح رویتِ ہلال کی جو خبر نشر کی جاتی ہے اس کا نشر کرنے والا شخص واحد ہوتا ہے جس کے متعلق یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ مسلم ہے یا غیر مسلم۔ عادل ہے یا غیر عادل۔ اس شخص واحد کی یہ خبر ہر شہر میں ریڈیو مکس متعدد ہونے کی وجہ سے متعدد ہو جاتی ہے ورنہ یہ خبر، خبرِ واحد ہی ہے۔

آپ نے دلائل ملاحظہ فرمائے؟ یہ ہے وہ مبلغِ علم و فضل جس کے سرمایہ پر ان حضرات کی تحریک ہے کہ حکومت سے مطالبہ کیا جائے کہ وہ اس قسم کے بوجھ بجھکڑوں کی ایک مجلس قائم کرے اور پھر اس مجلس کا فیصلہ حکومت کی طرف سے ملک میں نافذ ہوا کرے۔

افسوس ان مولویوں پر نہیں جو اس قسم کی تحریکیں کرتے رہتے ہیں۔ اسلئے کہ جیسا کہ ہم متعدد بار لکھ چکے ہیں، ان کے سامنے تو روٹی کا سوال ہے۔ اگر وہ اپنی اہمیت کو بڑھانے یا قائم رکھنے کی ایسی فکر نہ کریں تو ان کی روٹی خطرہ میں پڑ جاتی ہے لہٰذا انھوں نے تو تحفظ نفس (Preservation of self) کے طبعی تقاضے کے ماتحت ایسا کرنا ہی ہوا۔ افسوس ہے ہماری حکومت پر جو ان معاملات کو "علماء" کے سپرد کر کے اپنے آپ کو اقوامِ عالم کی نگاہ میں اضحوکہ بنا رہی ہے۔ جو حکومت اس امر کا فیصلہ بھی از خود نہیں کر سکتی کہ چاند نکلا ہے یا نہیں۔ اس حکومت کا ان اقوام پر کیا رعب پڑ سکتا ہے جو چاند تک پہنچنے کے تہیئے کر رہی ہیں! زمانے کی تاریخ پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ جو قوم پروہتوں (Priests) کی دست نگر رہتی ہے دنیا میں کبھی پنپ نہیں سکتی۔ خدا کرے کہ تاریخ کی یہ پکار ہمارے اربابِ بست و کشاد کے کانوں تک بھی جا پہنچے۔ قوم کی زندگی کا راز صرف اس میں ہے کہ خدا کے متعین فرمودہ قوانین (قرآن کریم) کی روشنی میں، مسائل زندگی کا حل، اپنے زمانے کے علم و بصیرت کی مدد سے کیا جائے ـــــ کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ!

۲۔ تنکوں کا پل

چونکہ مذہب کا فتویٰ یہ ہے کہ "شریعت میں عقل کو کوئی دخل نہیں ہوتا" اس لئے مذہب کے معاملات میں ہمیشہ "ایمان بالغیب" کا تقاضا ہوتا ہے۔ یعنی یہ تقاضا کہ جو کچھ کہا جاتا ہے اسے سمجھنے کی کوشش مت کرو۔ لب بہ بند و چشم بند و گوش بند۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ دلچسپ حقیقت بھی سامنے آتی رہتی ہے کہ اگر یورپ کی کسی ایجاد یا انکشاف سے مولوی کو اپنے پیش کردہ توہمات کی تائید میں ذرا سا بھی اشارہ مل جائے تو وہ اُسے جگہ بہ جگہ لئے پھرتا ہے اور لوگوں سے کہتا ہے کہ دیکھ لیا؟ آج کس طرح یورپ کا مادہ پرست دہریہ اسلامی تعلیم کی حقانیت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو رہا ہے۔ وہ یہ کہتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میں نے ایک ایسی دلیل قاطع پیش کر دی ہے جس کا توڑ دنیا میں نہیں ہو سکتا۔ وہ اسے اسلام کی بہت بڑی خدمت قرار دیتا ہے۔ گویا اسلام کا قصرِ بلند، بنیادوں سے کھوکھلا ہو جا رہا تھا انھوں نے اسے گرنے سے بچا لیا۔ اسی قسم کی ایک دلیل ملاحظہ فرمائیے۔ لکھنؤ کے ہفتہ وار اخبار صدق (بابت ۲۱ ستمبر) میں مدیر اخبار (عبدالماجد صاحب) رقمطراز ہیں:

> دنیائے سائنس کی دو تازہ اور تہلکہ انگیز خبریں اور دونوں ہمارے اور آپ کے کام کی۔
>
> پہلی خبر یہ کہ لندن میں "بین سیارہ جاتی" سفر کا انتظام کرنے والی سوسائٹی کا جلسہ ہوا۔ ۱۲ ملکوں کے ۵۰ نامی گرامی ماہر سائنس اس میں شریک ہوئے۔ طے یہ پایا کہ زمین سے راکٹ سے چلے ہوئے ہوائی جہاز روانہ ہو سکتے ہیں۔ یہ فضائی موٹریں ۵۰ ٹن کے وزن کی ہوں گی۔ زمین سے تین سو میل بلند ہو کر یہ موٹریں فضا میں معلق رہ جائیں گی۔ پھر وہاں سے دوسری منزل کی اڑان کے لئے انتظار ہوگا۔ زمین سے چاند تک فاصلہ غالباً تین منزلوں میں طے کر لیا جائے گا۔

یہ تھی خبر۔ اب اس پر تبصرہ ملاحظہ ہو۔

غرض یہ کہ انسان کی اڑان فضائے آسمانی میں اب "ناممکن" اور "خلافِ عقل" اور "خلافِ نیچر" نہ رہی۔ انسان ہی کی نہیں بلکہ اس کے ۵۰، ۵۰ ٹن وزن موٹر کی بھی۔ اور موٹر کے ٹھہرنے اور دم لینے تک کی منزلیں متعین ہوگئیں ـــــ نہ ہوئے آج سرسید مرحوم اور سید امیر علی اور مولوی چراغ علی معراج جسمانی اور وجود براق پر اپنے سارے عقلی اعتراضات و نکتہ چینیوں، احتمال آفرینیوں کو پرزہ پرزہ ہوتے اپنی آنکھوں سے دیکھتے۔

اللہ میاں نے بیسویں صدی کے بندوں کے ضعفِ ایمان و ضعفِ عقل دونوں پر ترس کھا کر کیسی آسان اور قریب الفہم نظریں بہم پہنچا دیں۔ نہ صرف معراج جسمانی کی بلکہ براق کے بھی سفر منزل در منزل کی!

ملاحظہ فرمائی آپ نے معراج جسمانی اور وجود براق کی دلیل؟ وہ دلیل جو "مولانا صاحب" کے نزدیک خالص منزل من اللہ ہے کیونکہ اسے "اللہ میاں نے بندوں پر ترس کھا کر بہم پہنچایا ہے"۔ اللہ کا کتنا بڑا احسان ہے ہم بیسوی صدی کے انسانوں پر کہ اس نے ہمارے ایمانوں کو محفوظ رکھنے کے لئے اس قسم کے ناقابل تردید دلائل بہم پہنچا دیئے۔ ورنہ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو جس طرح ہمارے پیشرو ضعفِ ایمان سے مر گئے اسی طرح ہم لوگ بھی مر جاتے۔

اور پھر کتنا بڑا احسان ہے مولانا عبدالماجد صاحب کا کہ انھوں نے اپنی خداداد بصیرت سے اس واقعہ سے یہ نکتہ پیدا کر دیا اور اس طرح کروڑوں انسانوں کے ایمان کو بچا لیا۔ ورنہ ہر شخص کی نگاہ اس قدر عمیق تھوڑی ہو سکتی تھی؟

یہ ہیں وہ تنکوں کے پل جن پر سے مولوی ہاتھی گذارتا رہتا ہے اور جی میں خوش ہو جاتا ہے کہ میں نے دین کا ستونِ محکم تھام رکھا ہے؟ مولوی کی یہی وہ حرکتیں ہیں جن سے اس نے خدا کے بصیرتِ مجسم دین کو سامانِ تضحیک بنا رکھا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ ساری دنیا عقل کی اسی سطح پر ہے جس پر وہ خود ہے۔ اس لئے وہ جس دلیل کو اپنے لئے مسکت سمجھتا ہے اس کے متعلق فیصلہ کر لیتا ہے کہ ساری دنیا اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیگی۔ اور ستم بالائے ستم یہ کہ اس احمقانہ "دلیل" کو اپنی طرف سے پیش نہیں کرتا بلکہ اس کی نسبت خدا اور اس کے رسول اکرمؐ کی طرف کر دیتا ہے اور اس طرح اپنے ساتھ (پناہ بخدا) انھیں بھی ..... کرتا ہے۔

ہم ان آسمان پر اڑنے والے مولانا صاحب سے پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ راکٹ کے ذریعے فضائی سفر کرنے والوں کے سامنے ایک مستقر ہے جس کی سمت وہ جانا چاہتے ہیں۔ چاند، مریخ یا کوئی اور ستارہ۔ لیکن آپ یہ فرمائیے کہ حضور نبی اکرمؐ اپنے جسد اطہر کے ساتھ جو اڑ کر آسمانوں کو تشریف لے گئے تھے تو حضورؐ کی منزلِ مقصود کونسی تھی؟ آپ یہی کہیں گے کہ حضورؐ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس بلایا تھا۔ تو اس سے یہ واضح ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں پر کسی خاص مقام میں جا گزیں ہیں جہاں پر ملاقات کے لئے نبی اکرمؐ کو بلایا گیا تھا!

کیا خدا کے متعلق اس قسم کے تصور کے بعد آپ دنیا کے کسی صاحبِ علم و ہوش کو اسلام کی طرف دعوت دے سکتے ہیں؟

اسلام کے ان نادان دوستوں سے کون کہے کہ کھیل کھیلنے کے لئے اور میدان بھی ہیں۔ خدا کے لئے، خدا، رسول اور قرآن کو تو بخش دیجئے!

یاد رکھئے! علم اور حقیقت قرآن کے اندر ہے۔ عجم کی وضع کردہ داستانوں میں نہیں۔ اسلام کے سب سے بڑے دشمن تھے وہ جنھوں نے ان داستانوں کو وضع کیا۔ اس کے بعد جنھوں نے انھیں پھیلایا اور جو آج انھیں اسلام کا نام دیکر دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

۳- دوسری شہادت

صدق کے مندرجہ بالا اقتباس کی ابتدا ان سطور سے ہوئی تھی:

دنیائے سائنس کی دو تازہ اور تہلکہ انگیز خبریں اور دونوں ہمارے آپ کے کام کی۔

ایک خبر تو آپ اوپر پڑھ چکے۔

دوسری خبر ایک اور مشین کی تیاری ہے جو ریڈیو سے کئی ہزار گنی طاقتور ہوگی اور وہ فضائے کائنات سے تمام بکھری ہوئی موجوں کو یعنی ان آوازوں کو جو زمانۂ ماضی میں کبھی اور کہیں بھی انسانی حلق و زبان سے نکل چکی ہیں از سر نو زندہ کر کے لے آئے گی اور ہم اس بیسویں صدی میں پہلی صدی اور اس سے قبل کی ساری صدیوں کی ایک ایک آواز کو بجنسہٖ اس کے اصلی لہجہ و تلفظ کے ساتھ سن سکیں گے۔

گویا حشر اجساد کا مسئلہ جہاں تک حشر اصوات کا تعلق ہے اب ایک مذہبی نظریہ نہیں بلکہ سائنٹفک حقیقت بنا چاہتا ہے۔ اور جو مسئلہ پرانے روشن خیالوں کی سب سے بڑی الجھن کا باعث بنا رہا اس کے ایک جزو پر تو سائنس کی مہر تصدیق اب صبح شام لگا ہی چاہتی ہے۔

"وہ دن جب طلوع ہوگا تو فخر و اعزاز کا دن ہوگا بخاری کے لئے۔ مسلم کیلئے اور ہمارے سارے محدثین کیلئے۔ کہ ان کی نقل کی ہوئی ایک ایک روایت کی تصدیق براہ راست راویوں سے لیکر خود صاحب حدیث تک سے ہو جائے گی۔

وہ دن کس کے لئے کیسا ہوگا؟ ان قیاسات میں جانا اور ان پر خوشیاں منانا ابھی قبل از وقت ہے۔ یہ تو اس وقت دیکھا جائے گا۔ لیکن ان صاحب کی نگاہوں سے یہ حقیقت اوجھل ہو گئی کہ "حشر اصوات" کا ایک یقینی مرقع اس وقت بھی ہمارے پاس موجود ہے اور اس میں کسی ظن و قیاس سے کام نہیں لیا گیا بلکہ ایک ایک حرف حتم و یقین کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس میں مذکور ہے کہ مسلمانوں کی قوم رسول اللہؐ کے سامنے ہوگی اور حضورؐ خدا کو مخاطب، اور اس قوم کی طرف اشارہ کر کے فرمائیں گے کہ

یٰرب ان قومی اتخذوا ھٰذا القرآن مھجورا (۲۵/۳۰)

اے میرے رب! (یہ ہے وہ) میری قوم جس نے اس قرآن کو چھوڑ رکھا تھا۔

تاکہ کسی کو شبہ نہ رہے کہ یہ لوگ کون ہیں؟ قرآن نے اس کی خود ہی وضاحت فرما دی۔ چنانچہ آیت مذکورہ صدر سے اوپر کی آیات یہ ہیں:

ویوم یعض الظالم علیٰ یدیہ یقول یٰلیتنی اتخذت مع الرسول سبیلا

جس دن یہ ظالم اپنے ہاتھ کاٹ لیں گے اور افسوس سے یہ کہیں گے کہ اے کاش میں نے رسول کے ساتھ راستہ اختیار کیا ہوتا۔

یعنی یٰویلتیٰ لیتنی لم اتخذ فلانا خلیلا۔ لقد اضلنی عن الذکر بعد اذ جاءنی وکان الشیطٰن للانسان خذولا (۲۵/۲۷-۲۹)

مجھ پر افسوس ہے کہ میں نے فلاں کو اپنا دوست بنا لیا جس نے مجھے قرآن سے بہکا دیا حالانکہ وہ میرے پاس آ چکا تھا۔ شیطان انسان کو اسی طرح ذلیل و خوار کر کے چھوڑ دیتا ہے۔

اور اس کے بعد ہے کہ رسول اللہؐ خدا سے شکایت کریں گے کہ یہ ہیں میری قوم کے وہ لوگ جنھوں نے اپنے پاس قرآن کے ہوتے ہوئے اسے چھوڑ کر میرے راستے کی بجائے کوئی اور ہی راہ اختیار کر لی تھی۔

کیا ان حضرات کو کبھی اس کا بھی خیال آیا کہ وہ دن بخاری اور مسلم اور ان کے متبعین کیلئے کیا ہوگا جب خود رسول اللہؐ فرمائیں گے کہ یہ ہیں وہ لوگ جنھوں نے قوم کو قرآن کی جگہ ان چیزوں میں الجھا دیا تھا جو نہ قرآن میں تھیں اور جنھیں نہ ہی میں امت کو دیکر آیا تھا؟ لیکن اس طرف خیال تو اس کا جائے جسے اس حقیقت پر یقین ہو کہ قرآن کا کچھ تعلق ہم سے بھی ہے۔ ان سے پوچھئے تو یہ کہدیں گے کہ "ان قومی اتخذوا ھذا القرآن مھجورا" میں اشارہ کفار مکہ کی طرف ہے۔ چلئے! چھٹی ہوئی۔ ان کے نزدیک قرآن کے تین حصے ہیں۔ ایک یہود سے متعلق ہے، ایک عیسائیوں سے متعلق اور تیسرا حصہ کفار مکہ سے متعلق۔ قرآن یوں ختم ہو گیا۔ باقی رہے مسلمان۔ سو ان کے لئے روایات ہیں، تفاسیر ہیں، ملفوظات ہیں! ان کے لئے کافی ہیں

یہ الٰہیات کے ترشے ہوئے لات و منات

ایک نیک اقدام

راولپنڈی سے محترم شیخ عبدالمجید صاحب اپنے خط میں لکھتے ہیں:

میری بیوی کی اور میری ایک عرصے سے خواہش تھی کہ ایک عمارت مدرسۃ القرآن تعمیر کی جائے۔ الحمد للہ کہ ہم دونوں کی یہ آرزو پوری ہوئی۔ ہم نے میونسپل کمیٹی، مری کے عین بالمقابل، مدرسۃ القرآن کی تعمیر کر دی ہے اور انشاء اللہ اپریل ۱۹۵۲ء سے اس میں باقاعدہ درسِ قرآن جاری کر دیا جائے گا جس میں اللہ کے فضل سے "معارف القرآن" کے طریق بیان کے مطابق قرآن کریم کی تعلیم دی جائے گی۔

ہم محترم شیخ صاحب اور ان کی اہلیہ محترمہ کی خدمت میں اس نیک اقدام کے لئے دلی ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہوئے دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی اس کوشش کے ذریعے وہاں کے مسلمانوں میں صحیح قرآنی تعلیم کو عام کر دے کہ

یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

ادارہ طلوع اسلام۔ کراچی

نقد و نظر

۱۔ لسان العصر یہ مجموعہ ہے ان نظموں کا جنھیں اکبر الہ آبادی کی بارگاہ میں مختلف شعراء نے بطور خراج عقیدت پیش کیا اور اختر انصاری صاحب اکبر آبادی نے مرتب کرکے، بزم اکبر کراچی کی طرف سے شائع کیا۔ اکبر کی شاعری اور پیام کے متعلق طلوع اسلام کی کسی سابقہ اشاعت میں لکھا جا چکا ہے۔ اس لئے ان منظومات کے نفسِ مضمون کے متعلق کچھ لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ البتہ جہاں تک پیرایہ بیان کا تعلق ہے، اس مجموعہ میں اچھی اچھی نظمیں بھی شامل ہیں۔ مجید لاہوری نے ایک "نئے چہرے" کو متعارف کرایا ہے جن کا نام ہے مولوی انعام الحق صاحب قدوسی گنگوہی، اور جن کا وزن انھوں نے لکھا ہے چار تولے چار ماشے۔ ان کی نظم، کلام اور پیامِ اکبر کو، خود اکبر کے رنگ اور الفاظ میں پیش کرنے کی نہایت کامیاب کوشش ہے۔ بعض نظمیں محض "ثواب" کی خاطر لکھی گئیں اور (غالباً) "خیالِ خاطرِ احباب" کی بنا پر داخلِ مجموعہ کر لی گئی ہیں۔ کتاب کی طباعت کتابت، کاغذ، جلد سب جاذبِ نگاہ ہیں۔ قیمت تین روپے۔ ملنے کا پتہ۔ بزم اکبر، ۵/۳ فاروق اعظم لائنز۔ کراچی ۲۔

۲۔ قرآنِ کریم جیبی سائز حیدر آباد (دکن) میں جلد سازی کا ایک کارخانہ تھا "محبوبیہ" وہ اب منتقل ہو کر کراچی آ گیا ہے۔ اس کارخانہ نے جلد سازی میں، فرسودہ اور پامال راہوں کو چھوڑ کر جدت طرازیوں سے کام لیا تھا۔ چنانچہ ان کے ہاں کی جلدیں دور دور تک شہرت حاصل کر چکی تھیں۔ انھوں نے وہی روش کراچی میں قائم رکھی ہے۔ اس وقت ہمارے پیش نظر تاج کمپنی کا شائع کردہ جیبی سائز کا قرآن کریم کا (معری) نسخہ ہے جس کی جلد بندی محبوبیہ والوں نے کی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جلد واقعی قابلِ قدر ہے۔ بڑی خوبصورت اور فولڈنگ ہونے کی وجہ سے، نہ ٹوٹنے والی۔ ایک چھوٹی سی خوبصورت ڈبیا میں بند تاکہ محفوظ بھی رہے اور سفر میں بھی بآسانی ساتھ رکھی جا سکے۔ نفاست پسند طبائع کے لئے ایک اچھا تحفہ ہے جو کارخانہ محبوبیہ، شیدی ولیج روڈ، لی مارکٹ، کراچی ۲ سے مل سکتا ہے۔

فرعون قاہر مولفہ حکیم اسمٰعیل احسن صاحب عیش

یہ کتاب مولف مرحوم کے صاحبزادے جلیل احسن صاحب عیش نے برائے تبصرہ ارسال کی ہے۔ لیکن چونکہ تبصرے کے لئے چند امور کی تشریح ضروری ہے اور جلیل صاحب نے اپنا پتہ تحریر نہیں کیا کہ ان سے وضاحت طلب کر لی جاتی اس لئے ان سے استدعا ہے کہ وہ اپنے مکمل پتے سے ادارہ کو اطلاع دیں۔

حوادث

تاخیر نہیں ہوتی، تعجیل نہیں ہوتی
تقدیر دعاؤں سے تبدیل نہیں ہوتی

مٹتی ہے اُبھرتی ہے بنتی ہے بگڑتی ہے
تخئیل کی دنیا کی تشکیل نہیں ہوتی

وہ بات ہی کیا جس کا حاصل ہی نہ ہو کوئی
وہ حکم ہی کیا جس کی تعمیل نہیں ہوتی

دستورِ ہوس جب تک آساں نظر آتا ہے
آئینِ محبت کی تشکیل نہیں ہوتی

ملتی ہیں حوادث میں کچھ مصلحتیں لیکن
ایسے بھی تو ہیں جن کی تاویل نہیں ہوتی

عریاں نظر آتی ہے انسان کی مجبوری
جب پختہ ارادوں کی تکمیل نہیں ہوتی

تھمتے ہی نہیں آنسو، رکتی ہی نہیں آہیں
اے غم، ترے مکتب میں تعطیل نہیں ہوتی

جب تک نہ گذر جائے آتشکدۂ غم سے
انسان کی سیرت کی تکمیل نہیں ہوتی

(اسد ملتانی)